اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ

ماہنامہ

البرہان

لاہور

دسمبر ۲۰۲۳ء

مُدِیر: پروفیسر ڈاکٹر محمد امین

سکول توجہ فرمائیں

مکتبہ البرہان کی تازہ پیش کش

مؤثر تربیت کے لیے

ایک ماڈل سکول کا خاکہ

پروفیسر ارشد جاوید
ماہر نفسیات

صفحات ۸۸

تعارفی قیمت ۱۰۰ روپے

مکتبہ البرہان، لاہور
0300-4107282

قارئین سے التماس

البرہان پچھلے 13 سال سے اپنی استطاعت کی حد تک علم وفکر کی شمع جلائے رکھنے کی کوشش کررہا ہے۔ موجودہ مہنگائی نے پرچے کی اشاعت کومزید مشکل بنادیا ہے۔اس کا سالانہ زراعانت 1000 روپے ہے۔ جو اصحاب (خصوصاً یونیورسٹی پروفیسرز) یہ زرِاعانت ادا کرنے کی استطاعت رکھتے ہیں ان سے درخواست ہے کہ وہ زرِاعانت ارسال فرمائیں تاکہ ادارے پر مالی بوجھ کم ہوسکے۔

حافظ محمد عمران طحاوی
انچارج سرکولیشن

برائے جازکیش **0300-4107282**
Syed Imran Raza Tahave

ڈاکٹر محمد امین کی چند اہم تصانیف

نمبر شمار	کتاب	صفحات
	عصری تعلیم کی اصلاح (اسلامی تناظر میں)	
۱	ہمارا تعلیمی بحران اور اس کا حل	۴۵۰
۲	اسلامی سکول کے خدوخال	۸۰
۳	تعلیم اور اس کا اسلامی کردار	۱۶۷
۴	یکساں قومی نصاب۔ خدشات ومضمرات	۲۰۸
۵	تدریس القرآن، پارہ ۱، ۲، ۳، ۳۰ برائے معلمین	۱۶۰
۶	تدریس القرآن، پارہ ۱، ۲، ۳، ۳۰ برائے طلبہ وطالبات	۴۸
۷	پنج سورہ مع پارہ عم (اُردو تفہیم)	۷۶
۸	ایک نئی یونیورسٹی کی ضرورت	۱۲۰
۹	اسلامی علوم میں تحقیق	۲۷۲
	طلبہ کی اسلامی تربیت	
۱۰	تعلیمی ادارے اور کردار سازی	۱۷۲
۱۱	تعلیمی اداروں میں تعمیر سیرت۔ ہینڈ بک وگائیڈ	۱۶۰
	اصلاحِ دینی مدارس	
۱۲	ہمارا دینی نظام تعلیم	۲۵۰
۱۳	نصابِ مدنیؒ	۴۰
۱۴	مدرسہ ڈسکورسز۔ مطالعہ وتجزیہ	۱۵۶
۱۵	اصلاحِ دینی مدارس	۳۵۲
	اسلامی تحریکیں	
۱۶	پاکستان کی دینی قوتیں غیر موثر اور ناکام کیوں؟	۲۴۰
۱۷	خاموش انقلاب ناگزیر ہے	۲۸۸
۱۸	عصر حاضر میں دین کا متوازن تصور	۸۴
۱۹	نئی اصلاحی تحریک کی ضرورت	۷۲
	تزکیۂ نفس	
۲۰	اسلام اور تزکیۂ نفس (مغربی فکر کے ساتھ تقابلی مطالعہ)	۹۰۳

نمبر شمار	کتاب	صفحات
۲۱	حقیقت تزکیۂ نفس (سوالاً جواباً)	۶۲
۲۲	اپنی اصلاح آپ کیسے؟	۵۶
۲۳	ترکِ رذائل (احمد جاوید)	۲۹۲
۲۴	اسلام اور تعمیر سیرت	۴۰۴
	اسلام اور مغربی فکر وتہذیب	
۲۵	اسلام اور تہذیبِ مغرب کی کشمکش	۱۷۶
۲۶	اسلامی اور مغربی اصطلاحات کا تقابلی مطالعہ	۱۷۶
۲۷	اسلام اور ردِ فکرِ مغرب	۲۱۶
	تفہیم دین	
۲۸	مسلم نشاۃ ثانیہ۔ اساس اور لائحہ عمل	۴۰۰
۲۹	شاتم رسول کے قتل کی شرعی حیثیت	۴۸
۳۰	رزم حق وباطل	۸۰
۳۱	اسلام اور پاکستان	۳۰۰
۳۲	عصر حاضر اور اسلام کا نظام قانون	۲۵۰
۳۳	مقالاتِ امین (جلد اوّل)	۶۷۶
۳۴	مقالاتِ امین (جلد دوم)	۶۴۲
	اللغة العربية	
۳۵	السلطة التشريعية_ دراسة مقارنة	۱۵۰
	English Books	
۳۶	Islamization of Laws in Pakistan	250
۳۷	Riyaz us Saliheen I & II	950
۳۸	Literal Translation of the Holy Quran Para 1-10	500

مکتبہ البرہان

136 نیلم بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور

ای میل ermpak@hotmail.com

ماہنامہ
البرہان
لاہور

جلد ۲۷، شمارہ ۱۲، دسمبر ۲۰۲۳ء / رجب المرجب ۱۴۴۵ھ

مشمولات

O فکرونظر

نوحہ ـ لہولہو غزہ — مدیر — ۴

O تعلیم وتربیت

ـ دینی مدارس: اصلاحِ نصاب کی ایک تجویز — ڈاکٹر طفیل ہاشمی — ۵

ـ بنّوں کا واقعہ — مدیر — ۶

ـ مسلم علم النفس اور جدید نفسیات — مکرم محمود — ۸

O فکرودانش / سیمینار

ـ عصرِ حاضر میں احیائے اسلام کے تقاضے — ڈاکٹر محمد امین — ۱۵

ـ روداد سیمینار 'عصر حاضر میں احیائے اسلام' — حافظ عمران طحاوی — ۲۱

O تفہیم دین

ـ اسلام کا سیاسی نظام: عوام کی اکثریت کی بجائے میرٹ پر انحصار کے شرعی دلائل — مدیر — ۳۴

ـ ردِّ الحاد و دہریت پر اُردو زبان میں لکھی گئی کتب — ڈاکٹر حسیب احمد خان — ۴۵

ـ غامدی مکتبِ فکر: تجزیہ و تنقید کا صحیح منہج — ۵۰

O اسلام اور پاکستان

ـ 'اسلامی جمہوریت' سے اسلام کیوں نہیں آ سکتا؟ — ڈاکٹر رشید ارشد — ۵۱

ـ ۲۰۲۴ء کے انتخابات: دینی سیاسی جماعتوں کا لائحہ عمل — ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری — ۵۳

O تفہیم مغرب

ـ امریکہ میں اسلام اور مسلمانوں کا مستقبل — خالد بیگ — ۶۱

ـ جدیدیت کیا ہے؟ — سید خالد جامعی — ۶۸

O عالم اسلام / افغانستان

افغانستان: دوسرے سال کی کارکردگی ـ ایک نظر میں — مدیر — ۷۶

English Section — ۸۲

Disputed Dilemmas - Interactions of Pakistani Media with the State and Islam

Dr. Javed Akbar Ansari

مدیر

ڈاکٹر محمد امین

ادارۂ تحریر

ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری

حافظ محمد عمران طحاوی

لیگل ایڈوائزر

محمد یحییٰ رشید، ایڈوکیٹ ہائی کورٹ

انچارج سرکولیشن

(0300-4107282)

[برائے خریداری، تجدید، شمارہ تاخیر سے ملنے کی شکایت اور مکتبہ البرہان کی کتب کی خریداری کے لیے]

زرِ اعانت: فی شمارہ 85 روپے

سالانہ 1000 روپے۔ پانچ سال: 5000 روپے

تاحیات 40,000 روپے

تحریک اصلاحِ تعلیم ٹرسٹ

سونیری بنک لمیٹڈ، مین برانچ، لاہور

PK92SONE0000120000056341

برائے رابطہ

136 نیلم بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور

برائے آن لائن مطالعہ

www.alburhaan.pk

کمپوزنگ: حافظ محمد محسن یوسف

0306-4640366

فکر و نظر

نوحہ

یہ نوحہ سقوطِ غزہ کا نہیں، ان بے حمیت مسلم سیاسی و عسکری حکمرانوں کا ہے جو سقوطِ غزہ کا انتظار کر رہے ہیں۔ جو اللہ سے نہیں ڈرتے لیکن امریکہ سے ضرور ڈرتے ہیں۔

یہ نوحہ پاکستان کی اُن دینی سیاسی جماعتوں کا بھی ہے جو صرف اپنی اپنی جماعت کے زیر نگیں غزہ کی حمایت میں ریلیاں نکالتے ہیں اور سارے مل کر بڑے بڑے جلوس نہیں نکالتے۔

معاف کیجیے گا! آپ کی ریلیوں سے بڑے جلوس تو لندن اور نیویارک میں کافر نکال رہے ہیں، انسانیت کی بقا کے لیے۔ اور آپ متحد ہو کر بڑے جلوس نہیں نکال سکتے، اسلامیت اور اُمت کی بقا کے لیے۔ تفو بر تُو اے چرخِ گردوں تفو

لہُولہُو غزّہ

اہل غزہ کے لیے ہماری دعائیں کیوں قبول نہیں ہو رہیں؟

آج کل ہماری ہر مسجد میں علماء کرام اور عوام غزہ کے مسلمانوں کے لیے کامیابی کی دعاء اور ظالم اسرائیل کے لیے بددعا کرتے ہیں لیکن نہ ہماری دعاؤں سے غزہ کے بے کس مسلمان ظلم سے بچ پا رہے ہیں اور نہ اسرائیل کے جنگی جہازوں میں کیڑے پڑ رہے ہیں۔ آخر کیوں؟

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ توکل سے پہلے اونٹ کا گھٹنا باندھو اور قبولیت دعاء کے لیے رزقِ حلال کا اہتمام کرو۔ اللہ تعالیٰ کا بھی فرمان ہے کہ ہم کسی قوم کی حالت نہیں بدلتے جب تک وہ خود اپنی حالت نہ بدلے اور اس کا یہ بھی فرمان ہے کہ وہ اپنی سنت تبدیل نہیں کرتا۔

لہٰذا ہمیں دعاء کے ساتھ دوا کی بھی فکر کرنی چاہیے اور دینی جماعتوں کو سڑکوں پر لاکھوں کے جلوس نکالنے کے ساتھ سب کو وزیر اعظم اور سپہ سالار کے دروازے پر بھی دستک دینی چاہیے کہ خدارا مظلوم فلسطینیوں کی مدد کے لیے فوری عملی اقدامات کریں۔

تعلیم وتربیت

ڈاکٹرطفیل ہاشمی

دینی مدارس ـ اصلاحِ نصاب کی ایک تجویز

پاکستان کے دینی مدارس کی ذمہ داری، میری رائے میں، دیگرممالک کے دینی مدارس سے یکسر مختلف ہے۔ یہ اسلامیہ جمہوریہ پاکستان ہے۔جس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں کا سماج مکمل طور پر، یہاں کی عدلیہ، انتظامیہ، مقننہ اور آرمی مکمل طور پر بنیادی اسلامی تعلیمات کی حامل اور اسلامی تربیت کا نمونہ ہو۔ ملک میں دینی مدارس ہی ایسے ادارے ہیں جن کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ اسلامی تعلیم وتربیت کے مراکز ہیں۔گویا سارے ملک کو ہر سطح پر ایسی قیادت فراہم کرنا انہی اداروں کی ذمہ داری ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کی پیرو ہو۔ سارے ملک میں ایک ہی طرح کا نصاب رائج کر کے ایک ہی ماڈل کے افراد تیار کرنے سے ملک کی متنوع ضروریات پوری نہیں ہوسکتیں۔

پاکستان میں کئی دینی ادارے ایسے ہیں جو بلا شبہ ارب پتی ہیں۔ گدیاں اور درگا ہیں تو کھربوں کی مالک ہوں گی. یہ تمام فنڈز پبلک نے رفاہ عامہ کے لیے انہیں مہیا کئے ہیں۔

اگر دینی مدارس اپنی مظاہر پرستی پر تھوڑا سا کمپرومائز کر کے ایک مختصر دینی لازمی کورس متعارف کرائیں اور اس کے بعد طلبہ کے رجحانات کے مطابق انہیں اپنے زیر نگرانی ایجوکیشن، لاء، کامرس اینڈ انڈسٹری، ایڈمنسٹریشن، بزنس، کیڈٹ وغیرہ کالجز میں داخل کر کے سارے ملک کے ہر شعبے کے لیے قیادت فراہم کریں تو پاکستان کی اسلامی ریاست کے تقاضے پورے ہو سکتے ہیں۔

جہاں تک کنونشنل کالجز اینڈ یونیورسٹیز کی بات ہے تو وہ جنرل مشرف کے دور سے ہی اس ملک کی سب سے بڑی انڈسٹری بنا دی گئی ہے وہاں کی ڈگریاں فیس ادا کرنے کی رسیدیں ہیں اور بس۔ وہ جو مال مارکیٹ کررہی ہیں وہ سوختنی ہے نہ فروختنی۔

تعلیم و تربیت مدیر

بنّوں کا واقعہ

متجددین اور علماء کرام۔ دونوں طرف سے انتہا پسندی کا رویہ

* بنّوں کا واقعہ پچھلے دنوں میڈیا میں کافی زیر بحث رہا۔ کالج کے سائنس کے ایک پروفیسر صاحب اپنی کلاس میں ڈارون کے نظریۂ ارتقا اور عورت و مرد کی برابری کے بارے میں لیکچر دیتے تھے۔ بات کسی وجہ سے پھیل گئی۔ مقامی علماء کرام نے اس کے خلاف بولنا شروع کیا، ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ پروفیسر صاحب کو دھمکیاں ملنا شروع ہو گئیں اور نتیجہ بالآخر یہ نکلا کہ پروفیسر صاحب نے علماء کرام کا مطالبہ مان لیا اور اپنے خیالات سے رجوع کا اعلان کرتے ہوئے اور علماء کرام کے خیالات کی تصویب کرتے ہوئے سٹیمپ پیپر پر دستخط کیے۔ یہ تصویر سوشل میڈیا پر وائرل ہوئی یا کرائی گئی۔

* ہماری رائے میں دونوں فریقوں کا رویہ صحیح نہیں تھا۔ ہم بھی یونیورسٹی میں برسوں پڑھاتے رہے ہیں اور اختلافی امور میں ہمارا رویہ یہ تھا کہ دونوں طرف کا نقطۂ نظر معروضی انداز میں بتا دیتے تھے اور اس طرح کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مذکورہ پروفیسر صاحب کو چاہیے تھا کہ وہ ارتقاء کے بارے میں ڈارون کا نقطۂ نظر بھی بتا دیتے اور اس بارے میں اسلام اور علماء کرام کا مؤقف بھی علمی اور معروضی انداز میں بتا دیتے تو کوئی مسئلہ پیدا نہ ہوتا۔ یہی روش عورت اور مرد کی مساوات کے حوالے سے اختیار کی جا سکتی تھی لیکن مذکورہ پروفسر صاحب کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ وہ مذکورہ مسائل میں اسلامی نقطۂ نظر کا ذکر تضحیک کے انداز میں کرتے تھے جو وجۂ شورش بنا۔

* پھر جب یہ مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا تو مسلم اہل دانش کا کام تھا کہ مذکورہ پروفیسر صاحب کو دلائل سے قائل کرتے کہ ان کا نقطۂ نظر کمزور اور غلط ہے۔ خود امریکہ اور یورپ میں ڈارون کے نقطۂ نظر کو غلط کہنے والے بے شمار سائنسدان اور اہل علم موجود ہیں اور اس پر وسیع لٹریچر انٹرنیٹ پر بھی دستیاب ہے۔ یہی حال عورت و مرد کے مساوات والے مسئلے کا ہے۔ بہت سے مسلم دانشوروں نے بھی ڈارون کے نقطۂ نظر کو دلائل سے غلط ثابت کیا ہے، وہ رائے بھی مذکورہ پروفیسر صاحب کے علم میں لا

کران کو صحیح نقطۂ نظر کا قائل کیا جا سکتا تھا۔ یا کم از کم انہیں اس پر مائل کیا جا سکتا تھا کہ وہ معروضی حوالے سے کلاس میں دونوں نقطہ ہائے نظر بیان کر دیا کریں۔ لیکن علماء کرام نے اس انداز میں اس کے خلاف محاذ کھڑا کیا کہ اسے اپنی خیریت خطرے میں محسوس ہوئی اور اس نے ڈر کر اور اپنی جان بچانے کے لیے ایک ایسی دستاویز پر دستخط کر دیے جس کا وہ نظریاتی طور پر قائل نہیں تھا۔ ہمارے نزدیک فکری اور نظری امور میں یہ جبر اور تحکم غیر مفید ہے اور اس کی حمایت نہیں کی جا سکتی۔

پھر علماء کرام نے ''اسلام'' کے نام پر جو مؤقف پروفیسر صاحب سے زبردستی منوایا وہ اسلام کا متفقہ مؤقف نہیں بلکہ ایک ''مسلک'' کا مؤقف تھا۔ سب جانتے ہیں کہ چہرے کے پردے کے بارے میں اہل علم میں اختلاف ہے۔ برصغیر کے روایتی علماء کا مؤقف چہرے کے پردے کا ہے جب کہ عالم اسلام میں بہت سے ممالک اور وہاں کے علماء خصوصاً علماء ازہر چہرے کے پردے کے قائل نہیں ہیں۔ لہٰذا دین پر عمل کے لحاظ سے اگر مسلم اہل علم میں اختلاف ہو تو کسی ایک نقطۂ نظر کو ''عین اسلام'' قرار دے کر اسے کسی مسلمان سے زبردستی منوانا جبر اور تحکم ہے جسے ہم غیر مناسب سمجھتے ہیں۔

* یہ دسمبر ۱۹۸۹ء کی بات ہے جب شیکاگو میں امریکی مسلم سوشل سائنسٹس کی تین روزہ سالانہ کانفرنس ہوئی جس میں امریکہ بھر کے مسلم اہل علم و دانش نے حصہ لیا۔ پاکستان سے علوم اسلامیہ کے پروفیسرز کا آٹھ رکنی وفد بھی اس کانفرنس میں شامل تھا، جس میں راقم الحروف بھی موجود تھا۔ اس کانفرنس میں منتظمین نے ایک سیشن میں ایک پروگرام رکھا کہ ''پاکستانی یونیورسٹیوں میں علوم اسلامیہ کی اعلیٰ تعلیم غیر مؤثر کیوں ہے؟''۔ اس میں ہمارے علاوہ امریکہ میں موجود بعض پاکستانی سکالرز نے بھی حصہ لیا۔ ان سب کا خیال تھا کہ پاکستانی یونیورسٹیوں میں علوم اسلامیہ کے حوالے سے اعلیٰ درجہ کی تحقیق اس لیے نہیں ہو رہی کہ یونیورسٹی سکالرز روایتی علماء کے متشددانہ رویے سے خائف رہتے ہیں اور ان کی آزادانہ سوچ پروان نہیں چڑھتی۔ لہٰذا یونیورسٹی سکالرز کو اس دباؤ سے آزاد ہو کر تحقیقی کام کرنے کی ہمت کرنی چاہیے۔

ہمارے قارئین جانتے ہیں کہ ہم مغربی فکر و تہذیب اور تجدد کے شدید مخالف ہیں اور اسے غیر اسلامی سمجھتے ہیں لیکن اس کے باوجود ہم سمجھتے ہیں کہ پاکستانی نژاد امریکی سکالرز کے مؤقف میں وزن ہے اور ہمارے روایتی علماء کرام میں اختلاف رائے کو برداشت کرنے کا رجحان کم ہے اور یہ چیز اصلاح طلب ہے۔

تعلیم و تربیت

مکرم محمود

مسلم علم النفس اور جدید نفسیات

انسان کے اندر معرفتِ نفس کا داعیہ اور اپنے آپ کو جاننے کا جذبہ فطری ہے۔ اس جذبے کی پرورش کا سامان فلسفیانہ اور صوفیانہ دونوں روایتوں میں مبادیات، ساخت اور مقاصد کے فرق کے باوجود بیک آن پایا جاتا ہے۔ یونان میں ڈیلفی کے اپالو مندر کی عمارت پر Know Thy Self کا کندہ ہونا یا صوفیاء کے ہاں 'من عرف نفسه فقد عرف ربه' کی روایت کا شائع وذائع ہونا اسی حقیقت کا اظہار ہے۔ اسی طرح اگر بنظرِ غائر دیکھا جائے تو فلسفیانہ الٰہیات یا مابعد الطبیعیات کا بنیادی سوال کہ وجود کیا ہے؟ بھی اس بات کو نظر انداز کر کے کہ سوال کرنے والا کون ہے کوئی معنی نہیں رکھتا۔ یعنی وجود کیا ہے؟ کا سوال اگر انسان کیا ہے؟ انا کیا ہے؟ شعور کیا ہے؟ کے سوالات کے ساتھ ہو تو پھر بامعنی ہے۔ اسی طرح یہ بات بھی اہم ہے کہ کسی بھی تہذیب کی داخلی بنیاد ان تین سوالات کے جوابات پر ہوتی ہے: انسان کیا ہے؟ کائنات کیا ہے؟ خدا کیا ہے؟ پھر انہی سوالات سے کچھ ضمنی سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً: ان میں باہمی رشتہ کیا ہے؟ ان میں مرکزی حیثیت کس کو حاصل ہے؟ خدا، انسان اور کائنات میں باہمی تعلق کی نوعیت اور ان میں سے کسی ایک کی مرکزی حیثیت کا تعین انسان کی کل زندگی کی سمت طے کرتا ہے اور کسی تہذیب کے خارجی مظاہر اور علوم وفنون اور ترجیحات کے تعین کا سبب بنتا ہے۔ ذیل میں چند نکات کی صورت میں مسلم علم النفس اور جدید نفسیات کی چند اساسات کا مختصر تذکرہ کیا جائے گا۔ مقصود اکیڈمک گفتگو سے پرہیز کرتے ہوئے جدید علم النفس کی کچھ بنیادوں اور عملی مظاہر کا مختصر بیان ہے۔ مسلم علم النفس کا تذکرہ ضمنی ہے کہ یہ اس کی ضد ہے اور ضد کے ذریعے ہی کسی شئے یا تصور کی صحیح معرفت ممکن ہوتی ہے۔ تُعرف الاشیاء باضدادھا۔

۱۔ مسلمانوں کے ہاں علم النفس کی نشو ونما اصلاً صوفیاء کے ہاں ہوئی ہے اور یہ ان کے تصورِ حقیقت یا جہانی تصور (worldview) کے تابع تھی۔ انسان کی تخلیق کا مقصد اور اس کی موجودگی کی غرض وغایت اگر اپنے پیدا کرنے والے کی عبادت ہے اور اس کے قرب کا حصول ہے تو عرفانِ نفس کی غایت بھی یقیناً یہی ہوگی کہ انسان اپنے اس مقصود ومطلوبِ حقیقی کو حاصل کر

سکے اور اس کے موانع یا حائل رکاوٹوں کو دور کر سکے۔ ہمارے ہاں علم النفس کی غرض و غایت تزکیہ اور تہذیبِ نفس رہی ہے۔ معرفتِ نفس گویا ایک اعتبار سے معرفتِ رذائل و فضائلِ نفس ہے۔

۲۔ علوم ایک خلا میں وجود نہیں پاتے بلکہ وہ کسی غالب تصورِ حیات سے ایک بدیہی تعلق رکھتے ہیں۔ جدید علم النفس (psychology) بھی اس کی ایک مثال ہے۔ اس کا جدید تہذیب اور جدید نظامِ سیاست و معاشرت و معیشت سے ایک فوری اور فطری تعلق ہے۔ جدید انسان ایک فرد ہے، تمام رشتوں اور اجتماعیتوں سے کٹا ہوا ایک فرد جو اسیرِ جبلت ہے اور باقی انسانوں اور نظمِ اجتماعی کے ساتھ طاقت اور مفاد کے رشتے میں منسلک ہے۔ یہ انسان جو کہ ایک تصور نہیں بلکہ حقیقت ہے، جدید نفسیات اس انسان کو فطری اور نارمل مان کر اپنے علمی اور عملی سفر کا آغاز کرتی ہے اور اس تصورِ انسان سے انحراف کو ابنارمیلٹی قرار دیتی ہے۔

۳۔ جبلت اور ذہن کے مابین ہم آہنگی کی خواہش انسان کے لیے فطری ہے۔ اس کے بغیر باطنی ٹھہراؤ ممکن نہیں ہے اور داخلی نفسی کشمکش کو کم نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ہم آہنگی جبلت اور ذہن ہر دو کی مرکزیت پر ممکن ہے۔ جدید نفسیات جبلت اور ذہن کی ہم آہنگی کو جبلت کے اصول پر دریافت کرتی ہے اور جبلت کی اصل آزادی کو قرار دیتی ہے (جبلت اگرچہ بذات خود ایک جبر ہے مگر یہاں آزادی سے مراد ہے کہ جبلت کسی خارجی قید یا جبر کو قبول نہیں کرے گی اور جبلت کے داخلی جبر کو انسان اپنے جملہ وسائل استعمال کر کے کم سے کم کرنے کی کوشش کرتا رہے گا۔ جبلت کا ہر ممکن اظہار دائرہ فطرت میں آتا ہے)۔ یعنی شعور تابعِ جبلت ہو جائے یا دوسرے لفظوں میں شعور آزادی کی قدر کو اپنی قدر الاقدار قرار دے دے۔ اس تصورِ ہم آہنگی جبلت و ذہن میں بعض اوقات جبلت کو ذہن کے تابع بھی کیا جاتا ہے مگر یہ کسی دوسری جبلت کی تسکین کے لیے ہوتا ہے نہ کہ کسی اخلاقی اصول کی بنیاد پر جو اپنی جڑیں آسمانی ہدایت میں رکھتا ہو۔ جبلتوں کے مابین لین دین بھی مفاد کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ اس لین دین اور جبلتوں کے داخلی توازن کو برقرار رکھنے کے لیے شعور کو کام میں لایا جاتا ہے۔

۴۔ جدید نفسیات انسان کی مادی تعبیر کے اصول پر استوار ہے۔ یعنی مادہ کے اصول سے انسان کے تمام ظاہری و باطنی قویٰ کی توجیہہ کی گئی ہے۔ شعور بھی مادہ ہی کا ایک انفجائی (emergent) مظہر ہے۔ شعور کا ظہور گویا ایک خاص مادی ترتیب کا نتیجہ ہے۔ اس

ترتیب کو ختم کر دیا جائے تو شعور معدوم ہو جائے گا کہ گویا تھا ہی نہیں۔ انسان کی یہ تعبیرِ نفسیات نظری ہو یا عملی ہر دو میں کلیدی حیثیت کی حامل ہے۔ یہی تعبیر اور اس کے مختلف مظاہر انسانی نفس کی تفہیم، نارمیلٹی اور ابنارمیلٹی کا تعین اور علاج کے منہج کو متعین کرتے ہیں۔ جدید مادی تصورِ حیات نے انسانی نفس کی مادی تعبیر کو ممکن بنایا، جو انسانی نفس کے فہم اور اس کے علاج کے منہج کو طے کرتی ہے۔ اسی کے ضمن میں وہ کلیدی اقدار اور تصورات آتے ہیں مثلاً آزادی، انفرادیت پرستی وغیرہ جو جدید نفسی طریق علاج میں بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔ یہ نفسیاتی صحت اور عدم صحت کے معیارات کا تعین کرتے ہیں۔ اگر بنظر عمیق دیکھا جائے تو نفسیاتی صحت اور عدم صحت کے معیارات کا تعلق نظاماتی مطابقت سے ہے۔ یعنی حاضر و موجود نظام' اس کی اقدار اور طرز ہائے احساس و عمل سے اگر آپ ہم آہنگی محسوس کرتے ہیں تو آپ نارمل ہیں۔ اگر آپ ان پر ہی سوال اٹھانا شروع کر دیں تو آپ اور کچھ بھی ہو سکتے ہیں لیکن نارمل کہلائے جانے کے مستحق نہیں۔ سسٹم کے نمائندے آپ کو ان سوالات کے جوابات بھی اپنے تئیں فراہم کرتے ہیں مگر ان کی اصل کوشش یہ ہوتی ہے کہ ان کی پیدائش کے عمل کو اپنی بنیاد میں ہی ختم کر دیا جائے یا اس پر قابو پا لیا جائے یعنی آپ کو دوبارہ سے نارمل بنا دیا جائے۔ دوسری بات یہ ہے کہ مادی تعبیر سے بظاہر کچھ اختلاف رکھنے والی جدید نفسیاتی تعبیرات بھی اپنی رسائی نفس تک ہی رکھتی ہیں اور نفس کی کچھ باطنی اور خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کر لینا ہی ایک کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ انسان جسم سے کچھ بلندی تو حاصل کر لیتا ہے یعنی نفسی ماورائیت کا ایک گونہ حصول تو ممکن ہو جاتا ہے لیکن روح جو اصلی ماورائیت کی حامل ہے' ان تعبیرات کے دائرے سے یکسر خارج ہی رہتی ہے۔

۵۔　عصرِ رواں میں انسان کے نفسی احساسات کو ایک بہت ہی بنیادی اہمیت دے دی گئی ہے۔ ہر نفسی احساس کو فطری قرار دے دیا گیا ہے۔ ان احساسات کی پیدائش کا عمل جدید معاشرتی صف بندی اور سسٹم کی تاثیرات سے خالی نہیں ہوتا لیکن کہا یہ جاتا ہے کہ ان احساسات کا واحد منبع انسانی نفس ہے، جو انسانی فطرت کا مکمل اظہار ہے۔ یعنی ہر وہ خیال جو سوچا جا سکتا ہے اور ہر وہ احساس جو محسوس کیا جا سکتا ہے اور ہر وہ کام جو کیا جا سکتا ہے، فطری ہے۔ گویا فطرت کوئی معیار نہیں ہے بلکہ انسان کی امکانی صلاحیت فکر و احساس و عمل کا نام ہے۔ انسانی احساسات کو بنیادی اہمیت دینے کے عملی اطلاقات اور مظاہر آج کل کے دور میں

کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ مثلاً gentle parenting کے جو اصول بتائے جاتے ہیں اس میں سے ایک یہ ہے کہ بچے کی feelings کو hurt نہ کیا جائے اس سے وہ trauma کا شکار ہو جائے گا اور بچپن کے تجربات اور traumas کو غیر معمولی اہمیت دی جاتی ہے۔ کوئی کہہ سکتا ہے کہ اس میں کیا مسئلہ ہے، ٹھیک ہی تو بات ہے لیکن اصل مسئلہ یہی ہے کہ کوئی اخلاقی اصول نہیں ہیں، گناہ ثواب کا کوئی تصور نہیں ہے۔ اصل چیز اندرونی احساسات ہیں اور trauma سے بچنا ہے۔ بات یہ ہے کہ اگر روک ٹوک نہیں ہوگی تو بچے کی تربیت کیسے ممکن ہوگی؟ اسی طرح اگر آپ دیکھیں تو جدید counselling اور psychotherapy بھی انہی اصولوں پر کھڑی ہے جو انسانی سوچ، احساس اور اظہار کی آزادی کو مرکزی اہمیت دیتی ہے۔ خاندان میں اگر کسی فرد کو کچھ مسائل کا سامنا ہے تو نفسیات دان ان مسائل کا حل یہ کبھی نہیں بتائے گا کہ آپ قربانی دیں یا کوئی اخلاقی حل پیش نہیں کرے گا بلکہ اس کی انا کو مزید ابھارے گا۔ اس کی انفرادیت کو اجاگر کر کے اس کے اظہار کی صورت میں ان مسائل کا سامنا کرنے کے طریقے سکھائے گا۔ اس انفرادیت کے اظہار کا نتیجہ اگر باقی خاندان والوں سے لاتعلقی ہو، جو اس کے کسی مادی مفاد سے ٹکراتی نہ ہو تو وہ اس کو یہی مشورہ دے گا۔

۶۔　سسٹم یا نظام، انسانی اقدار و تصورات اور ان کا خارجی عملی اظہار، جو صرف انفرادی انسانی اعمال کی شکل میں نہ ہو بلکہ اجتماعی اداروں کی شکل میں بھی ہو، سے مل کر وجود میں آتا ہے۔ ان اداروں میں سیاسی، سماجی اور معاشی ادارے ہیں جو انسانی زندگی کا مکمل طور پر احاطہ کرتے ہیں۔ نظاماتی تاثیرات صرف انسانی اعمال تک محدود نہیں ہوتیں بلکہ وہ انسانی تصورات، جذبات اور احساسات تک بھی اپنی رسائی رکھتی ہیں۔ جدید سماجی علوم میں ایک اصطلاح system integration کی استعمال ہوتی ہے۔ اس کا اگر سادہ اور سیدھا ترجمہ کیا جائے تو کچھ یوں مناسب رہے گا: ''نظامِ قائمہ کا ایک چلتا پُرزہ بن جانے کا عمل''۔ اس عمل میں دو جدید اداروں کا محوری کردار ہے۔ ایک جدید نظامِ تعلیم ہے جو اپنی بنیادوں میں ایک سیاسی عمل ہے، اخلاقی نہیں۔ سیاسی عمل سے مراد یہ ہے کہ یہ فرد کو نظمِ اجتماعی کا کامیاب حصہ بنا دیے جانے کی ایک ریاستی کوشش ہے اس بات سے قطعِ نظر کہ وہ نظمِ اجتماعی کن اصولوں پر اپنی اساس رکھتا ہے، وہ اصول اپنی کوئی ماورائی اساس رکھتے ہیں یا انسانی فکر و شعور کی اختراع

ہیں۔اچھی تعلیم کے حصول کا مطلب ہے کہ ایک فرد کے اندر سسٹم کے چلتے پُرزے بن جانے کی صلاحیت مکمل طور پر پیدا ہوجائے۔تعلیم یافتہ ہوجانے اور ایک دفعہ سسٹم کا حصہ بن جانے کے بعد سسٹم ان کو اتنا ''تر'' رکھتا ہے کہ پُرزوں کو کوئی رگڑ نہیں لگتی اور نہ ہی کوئی حرارت پیدا ہوتی ہے۔نظام ایک ہموار طریقے سے چلتا رہتا ہے۔دوسرا ادارہ جدید نفسیات اور اس کے ضمنی طرق ہائے فہم وعلاج ہیں۔یہ بھی system integration ہی کا ایک میکانزم ہے مگر یہ ثانوی ہے۔ثانوی ان معنوں میں کہ اس کا کام جدید تعلیم کی عمل داری کے بعد شروع ہوتا ہے۔جدید نظامِ تعلیم اگر کسی کو کامیابی کے ساتھ سسٹم کا حصہ نہ بنا سکا یا اگر حصہ تو بن گیا ہے مگر ''رگڑ'' اور ''حرارت'' پیدا ہو رہی ہے(رگڑ سے مراد کارکردگی کا تسلی بخش نہ ہونا یا inefficiency ہے۔یہ مرض متعدی ہے یعنی باقی پُرزوں کے کام کو بھی متاثر کرتا ہے۔حرارت سے مراد سسٹم یا نظام کے خلاف باغیانہ جذبات کا پیدا ہونا ہے۔)تو سائیکوتھراپی اس مسئلے کا حل ہے اور وہ فرد کو آزادی اور انفرادیت پرستی کے نام پر دوبارہ سسٹم کا حصہ بنانے اور نظام کو ہموار اور رواں چلتے رہنے میں مدد فراہم کرتا ہے۔نظامِ تعلیم گویا پیچھے سے زور لگاتا ہے اور عملی نفسیات کا ادارہ آگے سے قابو میں رکھتا ہے۔بنظرِ غائر اگر دیکھا جائے تو اس میں ایک تیسرا عامل بھی ہے اور اس کا کردار بھی اساسی ہے۔وہ عامل motivational speaking کا ہے۔اس کا کردار وسطی اور درمیانی ہے۔یہ مشین کے چلتے پُرزوں کو مسلسل تیل دینے کا عمل ہے تاکہ سسٹم کی رواں کارکردگی برقرار رہے۔اس کے ذریعے لوگوں کو یہ باور کروایا جاتا ہے کہ جو تم کر رہے ہو یہی تمہارے فائدے میں ہے اور جتنا کام تم کرو گے اتنا ہی پھل تمہیں ملے گا۔''کامیابی'' ہمیشہ سے تمہاری منتظر ہے۔بس تمہیں ہی تھوڑی ہمت دکھانی ہے۔لوگوں کو ان باتوں کا یقین دلانے کے لیے مذہب،تصوف،روحانیت،اخلاقیات،طبیعی اور سماجی علوم،نفسیات وغیرہ کا ایک حسین اور دلکش ملغوبہ بنا کر پیش کیا جاتا ہے جو ان میں سے کسی ایک خانے میں بھی صحیح نہیں بیٹھتا۔جدید علمِ نفسیات یہاں بھی خوب کام دیتا ہے۔

۷۔ جدید نفسیات میں انسان کے اندرون کی بہت اہمیت ہے۔اندرون یہاں کوئی صوفیانہ معنوں میں استعمال نہیں ہو رہا بلکہ اس سے انسان کی جبلتوں سے متعلقہ داعیات' احساسات اور جذبات مراد ہیں۔آج کل تو اس کا بہت ہی چرچا ہے کہ میری اندرونی نفسیاتی زندگی ہی میری شناخت کا تعین کرے گی۔یہ گویا انسان کو نفسیانے (psychologization) کا عمل

ہے جس کے بہت سے خطرناک نتائج کا ہمیں سامنا ہے۔ ان نتائج میں سے ایک موجودہ جینڈر ڈسکورس ہے جس میں انسان کے جینڈر کے تعین یا اس کی ضمنی شناخت کو اس کے ارادہ و شعور اور اس کے اندرونی احساسات کے تابع کر دیا گیا ہے اور اس کو ایک سیاسی مسئلہ بنا کر شناخت کی سیاست identity politics سے جوڑ دیا گیا ہے۔ Psychologization کا لازمی نتیجہ انسانی وجود پر اس کے نفس کی حاکمیت کی صورت میں نکلتا ہے۔ اس کا تعلق بھی آزادی کے اس مطلق تصور سے ہے جس پر کُل جاہلیتِ جدیدہ کی بنیاد ہے کہ ’’میرا جسم اور میری مرضی‘‘ یا صنفی شناخت بھی مجھ پر ایک جبر ہے اس کو بھی میری آزادی کے دائرہ میں آنا چاہیے۔ نفسیات اس کے لیے بہت حد تک مدد فراہم کرتی ہے اور ٹیکنالوجیائی ترقی بہت سی حیاتیاتی قدغنوں کو کم سے کم کرتی جا رہی ہے۔

۸۔ ’’Living a lie‘‘ یا ’’coming out‘‘ کے جو آج کل عام سلوگنز ہیں یہ تعینِ شناخت میں اندرونی نفسیاتی احساسات کی مرکزیت کو ہی ظاہر کرتے ہیں۔ میری حقیقت تو میرے احساسات ہی سے طے ہوگی۔ میرا جسمانی ظاہر اگر میرا ساتھ نہیں دیتا آیا تو یہ جھوٹ پر مبنی زندگی تھی۔ اب مجھے اپنی حقیقی ذات کو ظاہر کرنا ہے اور ظاہر کو اپنی حقیقت کے مطابق بنانا ہے۔ اس مطابقت میں جو نفسیاتی الجھنیں اور حیاتیاتی رکاوٹیں حائل ہیں ان کو دستیاب ذرائع سے دور کرنا ہے۔

۹۔ انسانی نفس کی بہت سی تفہیمات ہماری روایت میں کی گئی ہیں۔ ان میں سے جو ایک عام ہے اور امام غزالیؒ نے بھی جس کا ذکر کیا ہے وہ یہ ہے کہ انسانی نفس تین قوتوں سے مل کر وجود میں آتا ہے:　۱۔ قوتِ عقلیہ یا علمیہ　۲۔ قوتِ غضبیہ　۳۔ قوتِ شہویہ

ان کو اگر جدید اصطلاح میں بیان کیا جائے تو ذہن، ارادہ اور طبیعت بھی کہا جا سکتا ہے۔ ذہن کا تعلق قوتِ عقلیہ یا علمیہ سے ہے، ارادہ کا قوتِ غضبیہ سے اور طبیعت کا قوتِ شہویہ سے۔ روایتی نفسی علوم (چاہے ان کا تعلق کسی بھی روایت سے ہو) جن کا بنیادی تعلق انسانی نفس کی تہذیب و اصلاح سے تھا قطعِ نظر اس سے کہ یہ تہذیب و اصلاح خدا سے قرب کے لیے ہے، انکشافِ حقائق کے لیے ہے یا انسانی سعادت و کمال کے حصول کے لیے، سب

کے ہاں ان تین میں تابع ومتبوع ہونے کی ترتیب متعین تھی یعنی طبیعت ارادہ کے تابع ہونی چاہیے اور ارادہ ذہن کے۔ (ذہن کسی کے تابع ہوگا، یہ ایک الگ بحث ہے اور ہر روایت میں اس کو الگ طریقے سے دیکھا گیا ہے۔ مثلاً وحی کے، کلی اخلاقی اصولوں کے، بزرگوں سے چلی آنے والی تعلیمات کے وغیرہ وغیرہ)۔

انسانی وجود کو نفسیانے (psychologization) کا عمل اس ترتیب کو لازماً الٹ دیتا ہے اور ذہن اور ارادے کو طبیعت کے تابع کر دیتا ہے (ویسے ذہن خارج میں کسی شے کے تابع نہ ہو تو طبیعت یا خواہش کے تابع ہونا اس کا مقدر ہے)۔ نہ صرف یہ بلکہ اس ترتیب کو فطری اور معیاری بھی قرار دیتا ہے اور مطلق آزادی کی قدر کے داخلی اور خارجی تحقق کے لیے ضروری بھی۔

۱۰۔ جدید نفسیات میں انسانی اندروں کسی بھی قسم کی ماورائیت سے یکسر خالی ہے جبکہ ہماری صوفیانہ روایت میں اندروں کی ساری معنویت ہی اس میں ماورائی عنصر کی موجودگی سے پیدا ہوتی ہے، اگرچہ دوسرے نفسانی اور جبلی عناصر کا انکار نہیں کیا جاتا۔ تہذیب وتزکیہ نفس اصل میں ماورائی اور نفسانی عناصر کے مابین ہم آہنگی ہی کا نام ہے۔ جبلی اور نفسانی کا ماورائی کے تابع ہو جانا ہی نفس کا مہذب بن جانا ہے۔ شاہ ولی اللہؒ اس اصول پر نفس کو ملکیت اور بہیمیت کے دو رجحانات کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ ایک رجحان علوی ہے اور دوسرا سفلی۔ کسی کے نفس میں ملکیت کمزور ہوتی ہے اور بہیمیت طاقتور جبکہ کسی کے ہاں معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے۔ اسی طرح کسی کے ہاں ملکیت اور بہیمیت میں ہم آہنگی ہوتی ہے مگر کوئی ان کے درمیان مسلسل جنگ اور کشمکش کی کیفیت سے دوچار رہتا ہے۔ شاہ صاحبؒ کشمکش کے حامل لوگوں کو ''اہل تجاذب'' کہتے ہیں اور ہم آہنگی کے حاملین کو ''اہل اصطلاح''۔ ملکیت اور بہیمیت کے کمزور اور طاقتور ہونے اور ان کے درمیان ہم آہنگی اور کشمکش کی بنیاد پر شاہ صاحبؒ انسانی شخصیت کی آٹھ قسمیں بیان کرتے ہیں جو انسانی نفس پر ان کی گہری بصیرت اور عمیق نظر کو ظاہر کرتی ہیں۔ یہاں مقصود اس کی تفصیل بیان کرنا نہیں بلکہ صرف اس تضاد کو ظاہر کرنا ہے جو مسلم علم النفس اور جدید نفسیات میں پایا جاتا ہے۔ غرض یہ کہ روایتی علم النفس اور جدید نفسیات دونوں بالکل متضاد مابعد الطبیعیاتی اور نظاماتی سیاق وسباق رکھتے ہیں اور دو یکسر مختلف معاشرتی نتائج اور انسانی شخصیات کو جنم دیتے ہیں۔

تفہیم دین　　مدیر

عصرِ حاضر میں احیائے اسلام کے تقاضے

پاکستان کی دینی قوتوں کی کوششوں کا جائزہ اور نئی حکمتِ عملی کی ضرورت

بلاشبہ بہت سے کام ہو چکے جو قابلِ تعریف ہیں لیکن کچھ نہیں بھی ہو سکے۔ ضروری ہے کہ دینی تحریکیں اپنی خامیوں کا احساس کریں اور اپنی اصلاح کریں۔ بصورتِ دیگر نئی حکمت عملی وضع کی جانی چاہیے اور نئی تحریکیں اور ادارے قائم ہونے چاہئیں

مدیر البرہان کا 'عصر حاضر میں احیائے اسلام' سیمینار سے خطاب
جو ۵ نومبر ۲۰۲۳ء کو فلیٹیز ہوٹل لاہور میں منعقد ہوا

خطبۂ مسنونہ کے بعد،

* صُلب موضوع پر گفتگو سے پہلے اس عنوان کے الفاظ کی وضاحت کرنا چاہوں گا کہ چونکہ صحیح حدیث میں نبی کریم ﷺ نے اپنی ان سنتوں کے لیے ''احیاء'' کا لفظ استعمال فرمایا ہے جن پر لوگوں نے عمل چھوڑ دیا ہو اور اس پر عمل کی دعوت کو باعث اجر قرار دیا ہے[1] لہٰذا احیائے دین سے مراد ہے دین کی ان تعلیمات پر عمل کرنا جن پر عمل سے لوگ غافل ہو گئے ہوں۔ ہم نے 'احیاء اسلام' کی ترکیب کو 'غلبۂ دین' اور 'اقامتِ دین' وغیرہ کے مقابلے میں قابل ترجیح سمجھا کیونکہ مذکورہ الفاظ سے لوگوں کے ذہن اسلام کے سیاسی غلبے کی طرف چلے جاتے ہیں جبکہ اصل مقصود اللہ کی بندگی اور پورے دین پر عمل کرنا ہے، انفرادی زندگی میں بھی اور اجتماعی زندگی میں بھی (یعنی معاشرے اور ریاست میں) تاکہ مسلمان آخرت میں اللہ کی رضا حاصل کر سکیں اور اس کی نعمتوں کے مستحق ٹھہریں اور یہی درحقیقت سب سے بڑی کامیابی ہے۔

---

[1] عن بلال ابن الحارث رضي الله عنه ان النبی ﷺ قال: ''مَنْ اَحْيَا سُنَّةً مِنْ سُنَّتِي قَدْ أُمِيتَتْ بَعْدِى فَاِنَّ لَهُ مِنَ الاَجْرِ مِثْلَ مَنْ عَمِلَ بِهَا مِنْ غَيْرِ اَنْ يَنْقُصَ مِنْ أُجُورِهِمْ شَيْئًا....'' اخرجہ الترمذی وحسنہ (رقم الحدیث: ۲۶۷۷)، وابن ماجہ (رقم الحدیث: ۲۱۰) واخرجہ امام ابن عبد البر فی التمہید وشھد من حدیثی مسلم (رقم الحدیث: ۱۶۳۱ و ۴۹۶۰) وقال العسقلانی حدیث حسن، (ھدایۃ الرواۃ، ۱/ ۱۳۲) وعندالالبانی صحیح لغیرہ (صحیح ابن ماجہ، ص ۱۷۴)۔

* چونکہ خاتمۂ خلافت عثمانی (جو سمبل (Symbol) تھا ملت اسلامیہ کے زوال کا) کو ایک صدی گزر چکی ہے [۱] لہٰذا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ امت کے اہل علم اپنا احتساب کریں اور یہ دیکھیں کہ امت کو درپیش دو بڑے چیلنجز (زوال سے نکلنا اور مغرب کی اسلام و مسلم دشمن قوتوں کے استیلاء سے بچ کر احیائے اسلام و مسلمین کی راہ ہموار کرنا) سے نمٹنے میں انہیں کتنی کامیابی ہوئی ہے؟ کیا کچھ ہو چکا ہے اور کتنا کچھ ہونا ابھی باقی ہے؟

* ہم نے دینی قوتوں پر اس لیے ترکیز کی ہے کہ مسلم حکمرانوں اور دانشوروں کی اکثریت (الّا ماشاء اللہ) مغرب کی الحادی فکر و تہذیب کی بالادستی سے مرعوب ہے اور اس کی فکری بلکہ عملی غلام ہے لہٰذا لے دے کے ہمارے پاس صرف دینی قوتیں ہی بچتی ہیں جن سے کچھ توقع کی جاسکتی ہے۔

* زیر بحث معاملے میں دو ہی نقطۂ نظر اختیار کیے جاسکتے ہیں۔ ایک یہ کہ دینی قوتوں نے کامیاب جدوجہد سے مطلوبہ مقاصد حاصل کر لیے ہیں یا یہ کہ مطلوبہ مقاصد حاصل نہیں کیے جاسکے۔ ہمارا مؤقف یہ ہے کہ دینی قوتوں نے بلاشبہ محنت کی ہے اور اس کے بہت سے اچھے اور مثبت نتائج بھی نکلے ہیں لیکن مطلوبہ ہدف ابھی تک حاصل نہیں ہو سکا۔ اس حوالے سے اگر، پاکستانی تناظر میں، ہم تھوڑی سی تفصیل سامنے رکھیں تو منظر نامہ واضح ہو جاتا ہے۔ دینی قوتوں کے کام کو بالعموم پانچ بڑے دائروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

۱۔ تبلیغی و دعوتی تحریکیں (جیسے تبلیغی جماعت اور دعوت اسلامی)۔

۲۔ دینی سیاسی جماعتیں (جیسے جماعتِ اسلامی، جمعیت علماء اسلام جمعیت علماء پاکستان وغیرہ)

۳۔ تعلیمی ادارے (دینی مدارس)

۴۔ حلقۂ ہائے تصوف و خانقاہی ادارے

۵۔ جہادی تحریکیں

---

[۱] ہجری کیلنڈر کے لحاظ سے ۱۰۲ سال ہو چکے اور عیسوی کیلنڈر کے لحاظ سے سو سال ہونے والے ہیں۔

اب ہم ان پانچوں شعبوں کے کام کا مختصر جائزہ لیں گے:

تبلیغی ودعوتی جماعتیں

'تبلیغی جماعت' کا کام بہت وسیع اور مؤثر ہے اور بلاشبہ قابلِ تعریف ہے لیکن اس کا ہدف فرد کی بنیادی دینی امور میں اصلاح ہے جیسے کلمہ، نماز، روزہ، داڑھی، ٹوپی وغیرہ۔ پوری زندگی کی اصلاح اور خصوصاً اجتماعی زندگی یعنی معاشرے اور ریاست کے شعبوں کی اصلاح اس کا ہدف ہے ہی نہیں۔

دینی سیاسی جماعتیں

دینی سیاسی جماعتوں نے بلاشبہ دستور اور قوانین کو اسلامی بنانے میں کچھ کامیابی حاصل کی ہے لیکن ان میں سے اکثر قوانین پر عمل نہیں ہو رہا۔ پھر انہوں نے غلبۂ دین کو صرف سیاسی جدوجہد تک محدود رکھا ہے اور وہ بھی مغرب کی الحادی جمہوریت کی طرز پر "اسلامی جمہوریت" کے عنوان سے اور اپنی مسلک پرستی پر اصرار کرتے ہوئے؛ لیکن دعوت واصلاح سے انہیں اچھا مسلمان بنانے اور اپنا ہم خیال بنانے پر انہوں نے توجہ مرکوز نہیں کی۔ نتیجہ یہ ہے کہ سیاسی میدان میں انہیں خاطر خواہ کامیابی نہیں ملی۔

تعلیمی ادارے

دینی لوگوں نے بہت سے دینی مدارس اور مساجد قائم کی ہیں اور اس کا اعتراف کیا جانا چاہیے کہ پاکستان میں جتنی بھی دینی سرگرمیاں ہو رہی ہیں وہ انہی دونوں اداروں کی محنت کا نتیجہ ہیں لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان مدارس میں چند مذہبی مضامین صدیوں پہلے مرتب کیے گئے علوم کے مطابق پڑھائے جاتے ہیں۔ عصری دنیاوی علوم پڑھانا تو درکار وہ اپنے طلبہ کو ان سے واقف بھی نہیں کراتے۔ وہ دین کی بجائے اپنے اپنے مسلک کے علماء تیار کرتے ہیں اور ایسے افراد تیار ہی نہیں کرتے جو جدید مسائل میں قوم کی رہنمائی کرسکیں یا معاشرے اور ریاست کی اسلامائزیشن میں کوئی کردار ادا کرسکیں۔ مغربی فکر وتہذیب کا تنقیدی مطالعہ ان کے نصاب میں شامل ہی نہیں۔ مساجد عام طور پر مسلک اور فرقہ پرستی کا گڑھ ہیں۔

جدید یا عصری تعلیم ، جو مغرب زدہ ہے اور بگاڑ کا بنیادی سبب ہے، علماء کرام اس کی اصلاح میں دلچسپی نہیں لیتے۔ نہ انہیں ان کروڑوں مسلمان طلبہ کی اسلامی تعلیم وتربیت سے کوئی سروکار ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ کروڑوں کی تعداد میں ایسے افراد تیار ہو رہے ہیں جو نہ ذاتی زندگی میں اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہیں اور نہ معاشرے اور ریاست کو مغربی فکر وتہذیب کے سیکولر ولبرل اصولوں کی بجائے اسلامی اصولوں پر چلانا چاہتے ہیں۔

تصوف کے حلقے

تصوف جو کبھی اسلامی اصولوں کے مطابق مسلم افراد کا تزکیہ کرنے کا مؤثر ادارہ تھا اب انحطاط پذیر ہو گیا ہے۔ اکثر سجادہ نشین تصوف کے نام پر دنیا کمانے میں لگے ہوئے ہیں اور اسلامی تعلیم وتزکیہ سے بے خبر ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ صحیح نقطۂ نظر سے تزکیۂ نفس کرنے والے ادارے ہمارے ہاں بہت کم ہیں اور جو ہیں وہ بھی یا تو مسلک پرستی کے قائل ہیں یا متوازن اور جامع انداز میں تعمیر شخصیت نہیں کرتے۔

جہادی تحریکیں

جہاد بمعنی قتال کے دو پہلو ہیں۔ اقدامی جہاد اور دفاعی جہاد۔ اقدامی جہاد یعنی کافر حکمرانوں کا زور توڑنا تا کہ وہ عوام کو اسلام کے قبول ورڈ کا فیصلہ غیر جانبداری سے کرنے دیں، اس کی فی الوقت مسلمان اہلیت وقدرت نہیں رکھتے لہٰذا اشاعتِ اسلام کا کام پرامن طریقے سے انہیں جاری رکھنا چاہیے لیکن یہ کام بھی کما حقہ نہیں ہو رہا۔ دفاعی جہاد البتہ مسلمانوں پر فرض ہے اور نہیں اس سے پیچھے نہیں ہٹنا چاہیے جیسا کہ فلسطین، کشمیر، چینی ترکستان، چیچنیا، داغستان وغیرہ کے حالات ہیں یا ماضی میں عراق، افغانستان، لیبیا کے حالات تھے۔

جہاں تک غیر صالح مسلم حکمرانوں کے خلاف مسلح مزاحمت کا تعلق ہے، جسے خروج کہا جاتا ہے، تو ہماری رائے میں اس کا جواز بھی موجود نہیں کیونکہ دعوت واصلاح کے پُرامن راستے کھلے ہیں۔ پھر خروج کی کامیابی کا بھی کوئی امکان نظر نہیں آتا کیونکہ فی زمانہ ریاست اور اس کے عسکری ادارے بہت طاقتور ہو چکے ہیں اور انہیں کافر بین الاقوامی اسٹیبلشمنٹ کی سرپرستی بھی حاصل ہے لہٰذا خروج کی کسی کوشش کی کامیابی کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ اس بات

سے بھی صَرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا کہ اکثر ایسی تحریکیں مغربی خفیہ ایجنسیوں کے ہاتھوں میں کھیلنے لگتی ہیں اور مسلم معاشرے فتنہ وفساد کا شکار ہو کر کمزور ہو جاتے ہیں جیسا کہ مشرق وسطیٰ میں داعش، القاعدہ اور پاکستان میں تحریک طالبان کے تجربات سے ظاہر ہے۔ اس لیے پرامن جدوجہد ہی تبدیلی کا صحیح راستہ ہے جو کُھلا ہے۔

مذکورہ پانچ شعبوں کے حالات کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمان عوام وخواص دین سے دور ہو رہے ہیں، ہر قسم کے اخلاقی تنزل کا شکار ہیں اور شعوری ولاشعوری طور پر مغرب کی الحادی فکر وتہذیب کے اصول واقدار کو اپنا رہے ہیں اور بدقسمتی سے ایسے متجدد سکالرز بھی پیدا ہو گئے ہیں جو دین کے نام پر انہیں اِس طرف لے جا رہے ہیں اور جنہیں مغرب اور اس کے گماشتہ مسلم حکمرانوں کی سرپرستی بھی حاصل ہے۔

حل کیا ہے؟

ہمارے نزدیک مسلمانوں کے زوال کا بنیادی سبب یہ ہے کہ انہوں نے دین پر بحیثیت مجموعی اور کما حقہ عمل چھوڑ دیا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے قرآنی اصول ﴿يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ؕ ﴾[البقرہ ۲: ۱۲۹] پر عمل ترک دیا ہے جس پر عمل کر کے نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرام کی تعلیم وتربیت کی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ایسے جامع اور متوازن افراد تیار ہونا بند ہو گئے ہیں جو کتاب اللہ اور رسول اللہ (ﷺ) سے کما حقہ جڑے ہوئے ہوں۔ نتیجتاً ان میں وہ صلاحیتیں بھی پیدا ہونا بند ہو گئی ہیں جو شرطِ کامرانی ہیں جیسا کہ قرآن حکیم نے واضح طور پر بتا دیا ہے کہ:

- ﴿وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝۱۳۹﴾[آل عمران ۳: ۱۳۹]

"تمھی غالب رہو گے اگر تم سچے مومن بن جاؤ۔"

- ﴿وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ ۝۱۰۵﴾[الانبیاء ۲۱: ۱۰۵]

"ہم نے توریت کے بعد زبور میں بھی لکھ دیا تھا کہ جنت کے وارث صرف ہمارے

صالح بندے ہوں گے۔''

اس صورت حال کا حل یہی ہے کہ دینی قوتیں اپنے مذکورہ پانچوں شعبوں کی کماحقہ اصلاح کریں اور مذکورہ خامیوں سے بچنے کی حکمت عملی اپنائیں۔

* ہمارا تیس سالہ تجربہ یہ ہے [1] کہ دینی قوتیں اپنے اپنے لائحہ عمل پر نظر ثانی کرنے کے لیے تیار نہیں۔ تسلیم کہ ہماری کوششیں کمزور تھیں لہٰذا مزید کوششیں کی جاسکتی ہیں؛ لیکن اگر آخرِ کار دینی قوتیں اپنی حکمت عملی تبدیل کرنے پر تیار نہ ہوں تو تمام شعبوں میں نئے منہج پر کام کرنے کے لیے نئی تحریکیں، جماعتیں اور ادارے وجود میں لائے جانے ناگزیر ہیں۔

یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ دینی قوتوں کے مذکورہ مناہج مبنی بر اجتہاد ہیں اور انہیں کوئی تقدس اور لزوم حاصل نہیں اور انہیں بوقت ضرورت بدل لینا چاہیے لیکن بدقسمتی سے آج کے مسلمانوں کی ہر جماعت اور ہر مسلک یہ سمجھتا ہے کہ صرف وہ حق پر ہے اور باقی سب غلط ہیں۔ ہونا یہ چاہیے کہ ہر گروہ اپنے مؤقف کو مبنی بر اجتہاد اور قابل ترجیح سمجھے اور اختلاف رائے کے باوجود دوسری جماعتوں کے مؤقف کو بھی اسلامی سمجھے اور اسے نہ صرف برداشت کرے بلکہ ان سب میں باہمی اخوت اور تعاون کی فضا ہونی چاہیے کیونکہ سب لوگ جب دین ہی کا کام کررہے ہیں تو ان کی باہم چپقلش غیر محمود اور مضر ہے بلکہ ان میں اتحاد و اتفاق بہر حال مطلوب ہے۔

ہر شعبے کی تفصیل سے قطع نظر نئی حکمت عملی کے دو بنیادی اجزاء ہونے چاہئیں۔

تعمیرِ فرد: ایک یہ کہ تعلیم وتزکیہ اور دعوت واصلاح کے ذریعے ایسے افراد تیار کیے جائیں جو ایمان وعمل میں قرآن کے مطلوب انسان ہوں جس طرح کہ جامع اور متوازن انداز میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے صحابہ کرامؓ کی تربیت کی تھی؛ اور یہ افراد انفرادی زندگی میں دین پر عمل کے ساتھ مسلم معاشرے اور ریاست کو بھی اسلامی رنگ میں رنگ دیں۔ (بقیہ صفحہ نمبر: ۳۳)

---

[1] ہم تیس سال سے اصلاحِ تعلیم وتزکیہ، ردِّ فکرِ مغرب اور غلبۂ اسلام کے موضوع پر کام کررہے ہیں۔ اس پر ہماری تین درجن سے زیادہ کتابیں موجود ہیں۔ ماہنامہ البرہان پچھلے ۱۳ سال سے شائع ہورہا ہے اور علماء کے ساتھ 'ملی مجلس شرعی' چلاتے ہوئے ہمیں ۱۶ سال ہوچکے ہیں۔

فکرودانش

حافظ محمد عمران طحاوی

روداد سیمینار 'عصرِ حاضر میں احیائے اسلام'

پاکستان کی دینی قوتوں کی کوششوں کا جائزہ اور نئی حکمت عملی کی ضرورت

'مجلسِ فکرونظر' پاکستان کے معروف اہل علم حضرات کا مشترکہ علمی فورم ہے جس کے کنوینر مدیر البرہان ڈاکٹر محمد امین صاحب ہیں۔مجلس نے ۵ رنومبر ۲۰۲۳ء کو لاہور کے فلیٹیز ہوٹل میں ایک سیمینار بعنوان ''عصر حاضر میں احیائے اسلام- پاکستان کی دینی قوتوں کی کوششوں کا جائزہ اور نئی حکمت عملی کی ضرورت'' منعقد کیا۔ یہ سیمینار صبح 9:30 تا شام 5 بجے جاری رہا۔اس میں ممتاز علماء اور دانشورانِ ملت سے علمی استفادہ ممکن ہوا۔

نظامت کے فرائض راقم کے ذمہ تھے۔تلاوت ونعت کے بعد خطبہ استقبالیہ میں الاستاذ پروفیسر ڈاکٹر محمد امین صاحب نے فرمایا کہ ۱۹۲۴ء میں خلافت کے خاتمہ کے بعد سے اب تک ایک صدی گزر چکی ہے لہٰذا ضروری ہے کہ اہل علم ودانش اس امر پر غور کریں کہ امت درپیش چیلنجز سے نبرد آزما ہونے میں کتنی کامیاب ہوئی ہے؟ ہمیں دو بڑے چیلنجز درپیش تھے۔زوال سے نکلنا اور مغربی استعمار کے استیلا اور سازشوں سے بچنا۔ یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ ہم نے ان دونوں میدانوں میں کتنی کامیابی حاصل کی؟ ہم کیا کر پائے اور جو نہیں کر پائے اس کے لیے مزید سوچ بچار، پلاننگ اور اس پر عمل کی ضرورت ہے۔انہوں نے کہا کہ یہ ایک علمی مذاکرہ ہے، ایک مکالمہ ہے، ہر صاحب دانش اپنی رائے کا اظہار کرسکتا ہے لیکن ہماری نظریں اپنے موضوع پر فوکس رہنی چاہئیں۔

اس موضوع پر ڈاکٹر صاحب نے اپنے مؤقف کو تحریری شکل دے دی ہے جو اس شمارے میں نذرِ قارئین ہے۔

خطبہ استقبالیہ کے بعد اہل علم ودانش اور علماء کرام نے موضوع پر اظہارِ خیال کیا جن کے خیالات کے چیدہ چیدہ نکات پیشِ خدمت ہیں:

احمد جاوید

* یہ موضوع بڑا اہم ہے۔ تجدید و احیائے دین پر ہمارے ہاں پہلے بھی بڑا کام ہوا ہے جو وقت کے بہترین لوگوں نے کیا تھا۔ احیائے دین کے مقصود کو حاصل کرنے کے لیے جو پہلی کھیپ نکلی وہ سب بہترین لوگ تھے۔ شاہ ولی اللہؒ نے اپنے دور میں اور مولانا مودودی نے اپنے دور میں جو علم درکار تھا زمانے کو سمجھنے کے لیے لوگوں تک پہنچایا۔

* ہماری مسلم تحریکوں میں کسی مقصد کو لے کر اس کے لیے جدوجہد کرنے کا تصور اور روڈ میپ مغرب کی مثالوں کو دیکھ کر آیا ہے۔ جمعیت کا تصور کہ انسان ایک اجتماعی وجود ہے، اس پر ہم نے توجہ نہیں دی۔ بندگی کیا ہے اور بندگی کے تقاضے کیا ہیں؟ یہ ہم نہیں سمجھ سکتے اگر بندگی (عبدیت) ہمارے علوم میں مرکزی حیثیت نہ رکھتی ہو۔

* انسان کیا ہے؟ اس بارے میں ۵۰ علمی روایتیں اور ۲۰۰ نظریات ہیں۔ جس سانچے میں مغرب اصطلاحات وضع کرتا ہے، اگر ان کی وضع کردہ اصطلاحات کا جواب ہم اسی سانچے کے مطابق دیں تو جواب وہی نکلے گا جو وہ چاہتے ہیں۔ ہمیں اپنے امتیاز کو قائم رکھنے کی ضرورت ہے۔ اپنے امتیاز میں قوت بھی ہوتی ہے۔ ہم نے جوہرِ بندگی کو قربان کیا ہے۔ تصادم کی ہر بات کو ہم نے قبول کیا ہے۔ احیائے دین ہی احیائے مسلمین ہے۔

* مسلمانوں نے اپنے زمانے کو پہچانا نہیں اور جب پہچانا نہیں تو اس کی تیاری بھی نہیں کی۔ مغرب کے تصورِ الٰہ، تصورِ انسان اور تصورِ علم سے متاثر ہو کر اگر ہم کوئی کام کریں گے تو بالآخر مغرب ہی فاتح ہوگا۔

* مغرب کی فتوحات کا آغاز ہو چکا ہے۔ دین کیا ہے؟ اس کا جواب وہ ہمیں دے رہا ہے۔ وہ ہم میں سے چُن کر اپنے نمائندوں کو ڈکٹیٹ کرواتا ہے اور ہمیں ان کے ذریعے سے جواب دیتا ہے کہ دین کو کیسا ہونا چاہیے؟

* مذہب میں منافقت نہیں ہونی چاہیے۔ معاشرے میں تبدیلی کردار سے آتی ہے محض گفتار دھوکہ ثابت ہوتی ہے۔

* انسان کیا ہے؟ یہ ایک مجرد سوال ہے۔ انسان ایک منطقی تصور ہے۔ انسان کیا ہے؟ کے جواب میں منطقی خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ ہمارا سوال یہ ہونا چاہیے کہ بندگی کیا ہے؟ اس کا جواب ہم سب کے پاس ہوتا ہے بس اس کو یاد رکھنے کی ضرورت ہے۔ ہمارا نفس لوامہ ہمیں یاد کراتا رہتا ہے کہ بندگی کیا ہے؟ کیا بندگی زہد اور تواضع کے بغیر ہوسکتی ہے؟ کیا بندگی دنیا کی محبت سے مکمل طور پر خالی کیے بغیر ہمارے اندر جگہ بنا سکتی ہے؟ بندگی بندے کو حضورِ حق میں رکھتی ہے۔ دکھاؤ بندگی کیا ہے؟ محسوس کرو بندگی کیا ہے؟ بندے کو قائل کر دینے والی دلیل بندگی ہے، الفاظ نہیں۔ آپ کا کردار بندگی ہے۔ پہلے خود کو زندہ کریں پھر دین زندہ ہوگا۔

* احیائے دین کا ذریعہ تزکیہ ہے۔ وہ کیا چیز ہے جو اجتماعی ارادوں کو پورا نہیں ہونے دیتی؟ یہ غور کرنا بہت ضروری ہے۔ ہم نے دین کی ترجمانی پر غلط لوگ بٹھا رکھے ہیں۔ ادارے بنانے کی روش نے اخلاص کو نقصان پہنچایا ہے۔ تقلید شخصی اور شخصیت پرستی نے بھی یہیں سے جنم لیا ہے۔ یہ غلط رویہ ان میں بھی پایا جاتا ہے جو فقہ میں تقلید کے خلاف ہیں؟ وہی امام بنے پھر رہے ہیں۔ جب تک ہماری علمی سطح ہمارے دین سے حاصل کردہ بلندی پر کھڑی نہیں ہوگی، جب تک ہماری ذہنی سطح ہمارے ایمانی شعور کی بیداری کی وجہ سے بلند نہیں ہوگی، یہ سب نشستند، خوردند اور برخواستند ہے۔

* دین کے نام پر امیر ہونے والے لوگ بھی دین سے مخلص نہیں۔ وہ بھی اپنے مرنے پر سب کچھ دین کو وقف کرنے کو تیار نہیں حالانکہ انہوں نے سب کچھ دین کے نام پر بنایا ہوتا ہے۔ کیا ایسوں سے تبدیلی آسکتی ہے؟ احیائے امت کا خواب دکھانے والے تو بہت ہیں دیکھنے والے کمیاب ہیں۔ ہماری ذہنی سطح بالعموم پست ہے۔ ہم سنجیدہ مسائل پر غور کرنے سے بے بہرہ لوگ ہیں۔ ذہنی پستی نفس کو بھی خراب کرتی ہے اور دل کو بھی اجاڑ دیتی ہے۔ اخلاق کا دو چیزوں پر قیام ہے:

۱۔ مَیں اپنی نظر میں اچھا ہوں تو اچھا ہوں۔

۲۔ مَیں دوسروں کی نظر میں اچھا ہوں تو یہ نفاق ہے۔

تعلق مع الخلق کو خیر پر رکھتے ہوئے تعلق مع الحق کی صلاحیتیں رکھنا اخلاق ہے۔ اخلاق کی

کچھ بنیادیں ہیں۔حیاءصرف زن وشو کے تعلق میں نہیں ہوتی۔حیاء کا مطلب ہے خلوت میں بھی اللہ سے شرمانا۔اس شرم کا موجب حمیت ہے خشیت نہیں۔مجھے تنہائی میں سب کی نظروں سے جو چیز روکتی ہے وہ میری حمیت ہے کہ مَیں اللہ سے تعلق میں جھوٹا بنوں۔مَیں بے وفائی کا طعنہ سہوں۔حمیت خیر پر مائل بھی رکھتی ہے اور قائل بھی۔بلا تعطل جس کی تنہائی اسے مقربین کے احوال مہیا نہیں کرتی وہ نقصان میں ہے۔اگر آپ تنہائی میں قرب کے احوال حاصل نہیں کرتے تو آپ نقصان میں ہیں۔

معاشرتی لیول پر حیاء دوسرے کو خود پر ترجیح دینے کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔جیسے کسی نے مشاعرے میں جگر مراد آبادی کی جیب کاٹ لی۔دوست افسوس کرنے لگے تو انہوں نے کہا مجھے پتا ہے کہ میری جیب کس نے کاٹی ہے لیکن مجھے حیاء آتی ہے کہ پبلک میں اسے بے عزت کروں۔حیاء رب کے حضور جھکاتی بھی ہے اور یہی حیا معاشرے میں تواضع اور انکسار کے موقف پر رکھتی ہے۔مَیں اپنا حق چھوڑتا رہوں گا اگر معاشرتی حیاء پر عامل رہوں گا۔حیاء پر دعویٰ نہیں ہوتا۔ہمیں عمل کی ضرورت ہے۔

* آج جو آدمی بھی دنیاوی اعتبار سے قیمتی تحفہ لیتا ہے وہ طالبِ دنیا ہے۔

* آج ہر کوئی دنیا کی لالچ میں ہے۔احیاء کا کام تب ہوگا جب آپ کا مصلّٰی بھیگے گا، آپ تلاوت میں روئیں گے۔

* آخری بات: قوت وطاقت کے بغیر کوئی نظریہ، کوئی دین نہ اپنی حفاظت کر سکتا ہے نہ اشاعت۔قوت سے مراد علمی قوت بھی ہے اور فوجی قوت بھی۔لہٰذا ہمیں اپنی قوت وطاقت کو بھی بڑھانے کی ضرورت ہے۔

حامد کمال الدین (دانشور و مصلح)

یہ بہت اہم سیمینار ہے جس میں اہل علم سوچ بچار کے لیے جمع ہیں۔تمام اہل علم نے بڑی کارآمد باتیں کی ہیں۔عمل کرنے کے لیے کئی گروپ بنائے جانے چاہئیں۔اس طرح کے اور بھی پروگرام ہونے چاہئیں۔مذہب اور ریاست کی جنگ بہت پیچھے رہ گئی۔لبرل ازم اور

سوشل میڈیا کی وجہ سے معاشرہ بھی ہمارے ہاتھ سے نکل رہا ہے۔لہٰذا ضرورت ہے کہ مسجد کے کردار کو بحال کیا جائے۔اس معاملے میں محراب ومنبر مکمل خاموش ہے۔الحاد پر علماء کو تیاری کی ضرورت ہے۔اگر ہمیں حکومت نہیں مل سکتی تو کیا ہم ریاست سے دور رہیں گے یا اپنی اپنی کوشش کے مطابق اعلائے کلمۃ الحق کہنے کا حق ادا کریں گے؟ ہماری مسلکی گروہ بندیاں احیائے امت کی ضرورت پوری نہیں کر رہیں۔ ہمارے مدارس اور سیاسی جماعتیں بھی امت کے احیاء پر کچھ کام نہیں کر رہیں۔فکر کی ضرورت ہے۔

اوریا مقبول جان

ڈاکٹر محمد امین صاحب دردِ دل رکھنے والے آدمی ہیں۔اس سیمینار کا مقصد جمود بھرے ماحول میں ارتعاش پیدا کرنا ہے۔ ہر دور کا ایک فتنہ ہوتا ہے اس فتنے کا ادراک اگر قومیں نہ کریں تو ناقابل تلافی نقصان ہوتا ہے۔ ہمارے ملک میں آج ۳۲ ہزار دینی مدارس ہیں جن میں ۲۵ لاکھ طلبہ زیر تعلیم ہیں۔کراچی سے لے کر گلگت تک ان مدارس میں ردِّ رفض، ردِّ بدعت اور ردِّ شرک تو ملے گا مگر اس دور کے فتنے الحاد پر ردّ الحاد کی صورت میں کوئی تیاری نہیں ملتی۔ہم ان مدارس میں غزالی اور رازی نہیں پیدا کر رہے تو کون ہے جو تہافتہ الفلاسفہ لکھے گا؟

ہم تعلیم فروش لوگ ہیں۔ایک لاکھ سکول اسلامک سکولز کے نام پر موجود ہیں۔قرآن بھی پڑھا رہے ہیں، الحاد بھی پڑھا رہے ہیں جس میں سلیبس آکسفورڈ اور کیمبرج کا ہے۔'سنڈریلا ماں سے جھوٹ بول کر گھر سے بھاگتی ہے' پڑھاتے ہیں ساتھ لعنۃ اللہ علی الکاذبین بھی پڑھاتے ہیں۔اس دوغلے پن اور تعلیمی ثنویت نے ہمارا تمام نظام تعلیم برباد کر دیا ہے۔ہم اس کے زیر اثر سائنس کو بھی سچا کہتے ہیں اور خدا کو بھی۔ہم علماء کو اپنا محسن مانتے ہیں۔ان لوگوں نے مخدوش حالات میں بھی دین کا کام سنبھال رکھا ہے مگر دورِ حاضر کے فتنے الحاد پر ہماری تیاری بہت ضروری ہے۔ ہمارے ملک میں ۴۰۰ سکول آغا خان کے ہیں انہوں نے اپنا تعلیمی بورڈ بنا لیا ہے۔علماء اپنا تعلیمی بورڈ نہیں بنا سکے یہ المیہ ہے۔

ہم پاکستانی مومنانہ فراست سے خالی قوم ہیں۔ ہمارے ہاں الحادی لوگوں کی ممبر شپ کی تعداد ستائیس لاکھ ہو چکی ہے۔متاثرین اس کے علاوہ ہیں۔ہم نے مدارس میں طلبہ کی ایسی

تربیت نہیں کی کہ وہ دورِ حاضر کے اس الحادی چیلنج کا سدباب کر سکیں۔

میڈیا اور تعلیم میں ہم نے اپنی نسلِ نو کے لیے کوئی کام نہیں کیا۔ کلچر تعلیم اور میڈیا کے ذریعے آتا ہے۔ کلچر بدلے تو دین کا ڈھانچہ بدل جاتا ہے۔ ہمارا اس پر بھی دھیان ہونا چاہیے۔ سوشل میڈیا نے ہمارے نوجوانوں کو بالکل بدل کے رکھ دیا ہے۔ دور کے بدلنے سے چیلنجز بھی بدل گئے ہیں۔

مولانا زاہد الراشدی

۱۔ احیائے امت کے لیے تمام مسائل کا ادراک کر کے ان کے حل کے لیے ایک ماسٹر پلان بنایا جائے تاکہ احیاء ممکن ہو سکے۔ اس میں تمام اہلِ علم شامل ہوں اور دردِ دل کے ساتھ شامل ہوں۔

۲۔ ایک اجتماعی شوریٰ بنائی جائے جسے آج کی زبان میں تھنک ٹینک کہتے ہیں، جس طرح حکیم سعید صاحب نے ہمدرد شوریٰ بنائی تھی۔ اسے دیکھ کر بڑا حوصلہ ہوتا تھا کہ سوچنے والے بزرگ موجود ہیں۔ مَیں بزرگ اہل علم و دانش سے عرض کروں گا کہ اپنے بعد کے لوگوں کے لیے ٹیم بنا کر جائیں کہ جانا تو سبھی کو ہے۔

۳۔ اہداف کے حصول کے لیے تقسیمِ کار بھی طے کریں۔ ہر بندہ ہر کام نہیں کر سکتا۔ ہر میدان کے ماہرین کو احیائے امت کے عظیم کام میں شامل ہونا چاہیے۔

مجیب الرحمٰن شامی

ڈاکٹر امین صاحب نے ایک اہم موضوع پر غور کرنے کی ہمیں دعوت دی ہے۔ بلاشبہ پاکستان میں فرد کی اصلاح پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ فرد سے معاشرہ بنتا ہے، معاشرہ کی اصلاح ہو گئی تو ریاست کی اصلاح بھی ہو جائے گی۔

یہ ایک المیہ ہے کہ ہمارا نظامِ تعلیم کسی سیاسی پارٹی کی ترجیحات میں شامل نہیں۔ پاکستان کے لاکھوں بچے کروڑوں روپے دے کر اے لیول اور او لیول کا امتحان دیتے ہیں اور اُن کو کچھ پتہ نہیں کہ اقبال اور محمد علی جناح کون تھے۔ یہ بچے اسلام اور نظریہ پاکستان کیا جانیں گے؟

دینی مدارس اور مساجد بہت بڑی قوتیں ہیں۔ مدارس میں تقابلِ ادیان، معاشرتی علوم، سائنس اور جدید علوم پڑھائے جانے چاہئیں۔کرپشن کے بارے میں قانون سازی ہونی چاہیے۔مسلم ممالک کو مشترکہ منڈی، مشترکہ مارکیٹ، مشترکہ تھنک ٹینک قائم کرنا چاہیے۔ پُرتشدد تحریکوں کی حوصلہ شکنی ضروری ہے۔میری تجویز یہ ہے کہ ساری دینی جماعتوں کی ایک مشترکہ مجلس شوریٰ ہونی چاہیے جو پاکستان میں اسلام کے موضوع پر غور وفکر اور پلاننگ کرتی رہے۔

ڈاکٹر فرید احمد پراچہ

دنیا کے حالات تیزی سے تبدیل ہوئے ہیں۔عصرِ حاضر سے آگہی امت کے لیے بہت ضروری ہے کہ پہلے جنگیں بہادری سے لڑی جاتی تھیں اب ذہانت سے اپنے دشمنوں کو زیر کیا جاتا ہے۔ ہمارے زوال کے پیچھے غیر دینی اذہان ہیں۔اسلام کا سیاسی نظام اللہ کی حاکمیت کا نام ہے تاہم یہ حاکمیتِ اعلیٰ بھی انسانوں کے ذریعے قائم ہوتی ہے۔آج سیاسی نظام میں تبدیلی ووٹ کے ذریعے سے آتی ہے لہٰذا ہم اس نظام کو چھوڑ کر کامیاب نہیں ہو سکتے۔مغربی دنیا یہ کہہ رہی ہے کہ پولٹیکل اسلام ان کے لیے خطرہ ہے لہٰذا وہ ہر طرح سے مخلص مسلمانوں کو اس سیاسی دائرے سے باہر رکھنا چاہتے ہیں۔ ہمارے ملک کی دینی سیاسی قوتوں کو چاہیے کہ ان حالات میں مل کر سیٹ ایڈجسٹمنٹ کرتے ہوئے الیکشن کا حصہ بنیں تاکہ زیادہ سے زیادہ دینی لوگ اسمبلیوں میں پہنچ سکیں۔الیکشن میں دھاندلی نہ ہو اور صرف اہل امیدوار الیکشن لڑیں۔اس کے لیے آئین کی دفعہ ۶۲، ۶۳ پر عمل ضروری ہے۔الیکشن کمیشن آرڈر دے کہ جو لوگ الیکشن لڑنا چاہیں وہ ایک سال پہلے درخواست دیں۔ایک سال ان کے کردار و اعمال کا جائزہ لیا جائے ان میں سے جو دفعہ ۶۲، ۶۳ پر پورا اُترے صرف وہی الیکشن لڑے تاکہ نااہل لوگ اسمبلیوں میں نہ پہنچیں۔

ڈاکٹر ابصار احمد (سابق صدر شعبۂ فلسفہ، جامعہ پنجاب)

آج کے اس سیمینار کا موضوع بہت اہم ہے۔ انٹرنیٹ نے ہماری مشرق ومغرب کی حدود کو ختم کر دیا ہے۔مثلاً ابھی تین دن پہلے اسلامک اکیڈمی کراچی نے مریم جمیلہ مرحومہ پر پروگرام کیا ہے جو مغرب سے ہجرت کرکے پاکستان آئیں، مسلمان ہوئیں اور تمام زندگی

پاکستان میں گزاری۔ موبائل سمارٹ فون نے بہت کچھ سمارٹ کر دیا ہے۔ مغرب میں بہت سے دینی حلقے بڑا اچھا کام کر رہے ہیں۔ مثلاً کیمبرج میں ایک مسجد قائم ہوئی ہے جہاں اسی یونیورسٹی کے تھیالوجی کے پروفیسر اور اس مسجد کے خطیب شیخ عبدالحکیم مُراد ہیں۔ ان کا اصل نام Kim Binter تھا۔ ۲۰، ۲۱ سال کی عمر میں اسلام کی طرف آئے پھر علوم القرآن اور اسلامی علوم کو پڑھا۔ اب وہ جو لیکچر دے رہے ہیں وہ کمال کے ہیں۔ وہ نقشبندی سلسلہ میں بیعت بھی ہیں اور عربی کے علاوہ ترکی زبان بھی جانتے ہیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ عصر حاضر کے تناظر میں ان نومسلم دانشوروں کے کام پر بھی نظر ہونی چاہیے۔ امریکہ میں شیخ حمزہ یوسف لیجنڈری شخصیت ہیں۔ ۱۱، ۱۲ سال انہوں نے افریقہ میں جا کر پڑھا ہے، پھر مڈل ایسٹ، اردن اور ترکی میں بھی رہے۔ ان کا بھی اسلام کا گہرا مطالعہ ہے۔ انہوں نے ایک کالج بنایا ہے۔ Zaitoonah College of Librel Arts جو کیلی فورنیا میں ہے۔ یہ سوشل سائنسز پر اہم کالج ہے۔

۶۰ کی دہائی میَں جب میں کیمبرج گیا تو کوئی تصور نہیں کر سکتا تھا کہ یہاں اتنی بڑی مسجد بھی ہوگی اور Kings College کے بڑے ہال میں رمضان کی ایک بڑی افطار پارٹی ہوئی جس کی ویڈیوز موجود ہیں۔ وہاں اذان ہوئی اور نماز بھی ہوئی۔ تمام مذاہب کے ماننے والے اور نہ ماننے والے سبھی مدعو تھے۔ ڈاکٹر امین درست کہتے ہیں کہ معاشرے میں تبدیلی کا آغاز فرد سے ہوتا ہے۔ آپ کے علم کے لیے عرض کروں کہ Hasan Sparker یہ Reverted Parents کے صاحبزادے ہیں۔ مغرب میں اسلام پر بڑا کام کر رہے ہیں۔ غرض یہ کہ احیائے اسلام کا کام اللہ تعالیٰ اہل مغرب سے بھی لے رہا ہے اور نا اُمید ہونے کا کوئی جواز نہیں۔

سجاد میر (سینئر جرنلسٹ و اینکر پرسن)

* توحید کی بات کرنے والوں کا توحید پر اصرار ہے مگر کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ توحید کا اس طرح سے ذکر کہ رسالت کے مقام کو نظر انداز کر دیا جائے یہ رویہ بھی درست نہیں ۔

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دین ہمہ اوست
اگر باُو نہ رسیدی تمام بولہبی است

* اس ملک میں جتنے گناہ ہیومن رائٹس اور جمہوریت کے نام پر ہوتے ہیں شاید کسی اور معاملے میں نہ ہوتے ہوں۔ کراچی میں ڈاکٹر منظور صاحب کے ہاں، جو ایک خاص فکر کے فرد تھے، اہلِ علم حضرات کی ماہانہ نشست ہوا کرتی تھی۔ وہاں ڈاکٹر منظور صاحب نے ایک دفعہ کہا کہ کچھ بین الاقوامی قوانین ایسے ہیں جنہیں ہمیں مان لینا چاہیے میں نے عرض کیا مثلاً کون سے؟ کہنے لگے جیسے ہیومن رائٹس، مَیں بولا کہ نہیں، مَیں نام نہاد ہیومن رائٹس کو نہیں مانتا بلکہ حقوق العباد کو مانتا ہوں۔

* ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہم نے اپنی علمی بحثوں کو مسلم روایات سے لینے کی بجائے باہر سے خریدے ہوئے کچھ نظریات کی روشنی میں دیکھنا شروع کر دیا ہے۔ مثال کے طور پر مغربی فکر میں خدا کا تصور ہی نہیں۔ ہیومن رائٹس کا تصور پیدا ہی تب ہوا جب مغرب نے خدا کے وجود کا انکار کر دیا اور کہہ دیا کہ God is dead جب خدا ان کے ہاں نہیں رہا تو بولے کہ انسان کا سب سے بڑا مسئلہ انسان ہے۔ انسانوں کے بارے میں فیصلہ کرنے کا حق بھی انسانوں کو ہے۔ مذہب کی جگہ فلسفہ نے لے لی۔ فلسفہ معاشرت میں مخل ہوا تو سول سوسائٹی نے جنم لیا، NGOs بنائی گئیں۔ لوگوں کو چھوٹے چھوٹے کاموں میں مشغول کر دو۔ مدرسوں کو بدلو، کمپیوٹر لے آؤ، انگریزی پڑھا دو۔ خدا را اس طرح تبدیلی نہیں آئے گی۔ نظام تعلیم اور نصاب تعلیم بدلے بغیر کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ مدارس کے ۵ وفاق تھے اب ۱۵ بن گئے ہیں۔ کیا یہ تبدیلی لائیں گے؟ کیا ان مدارس کا ایک تعلیمی بورڈ نہیں بنایا جا سکتا؟ دوسری طرف سکول کی تعلیم میں ایک مضمون اسلامیات کا داخل کر دینے سے اسلامی فکر پیدا نہیں ہو سکتی۔ ہم جب تک مجموعی طور پر ایسا نصاب نہ بنائیں جو مردم خیز اور انقلاب آفریں ہو، تبدیلی نہیں آئے گی۔

* ہمیں پورے طور پر اسلام میں داخل ہونا ہوگا۔ یہی قرآن کا پیغام ہے۔ اسی میں کامیابی ہے۔ تمام دینی جماعتوں کے کام کو سراہنا چاہیے۔ وہ اپنا حصہ ڈال رہی ہیں تاہم مسلک سے بالاتر ہو کر کام کیا جائے تو زیادہ نتیجہ خیز ہوگا۔

مولانا عبدالغفار روپڑی (امیر جماعت اہل حدیث، پاکستان)

نہ ریاست ہمارے پاس ہے، نہ فرد اور معاشرہ ہمارے پاس ہے۔ اس کی ساری وجہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات سے دوری ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دین کو چھوڑ کر لوگ اپنے اپنے مسلکوں کی پیروی میں لگے ہوئے ہیں۔ قرآن وسنت کو اپنی ترجیح اوّل بنا کر اللہ کو راضی کرتے ہوئے دنیا اور دین دونوں میں کامیاب ہوا جاسکتا ہے۔ مجھے تو اور کوئی حل نظر نہیں آتا۔

ڈاکٹر علی اکبر الازہری (شعبہ علوم اسلامیہ، گریژن یونیورسٹی، لاہور)

احیائے اسلام کے لیے میری تجویز یہ ہے کہ تعلیم کتاب وحکمت اور تزکیۂ نفس کا اہتمام کیا جائے۔ جس طرح سقوطِ بغداد کے بعد شیخ عبدالقادر جیلانی نے لوگوں کی تربیت کا بیڑہ اٹھایا جس کی بناء پر آپ کا لقب محی الدین پڑا۔ دینی مدارس اور مساجد کے حقیقی کردار کا احیاء کیا جائے اور رجال سازی کے لیے صوفیاء کی طرز پر نظام کو فعال بنایا جائے۔ ضروری ہے کہ ہم اپنے نظام تعلیم کو اسلامی تقاضوں کے مطابق بدلیں اور اپنی نئی نسل کی اسلامی تربیت کا اہتمام کریں۔ اس کے بغیر نہ فرد کی اصلاح ہوسکتی ہے اور نہ معاشرے اور ریاست کی۔

علامہ ابتسام الٰہی ظہیر

امتوں کے زوال کی وجہ اللہ کی آیات کا انکار اور اس کے احکامات سے روگردانی ہوتا ہے۔ علامہ اقبال بھی یہی کہتے ہیں کہ ؎

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

اللہ نے خلافت ارضی کا میرٹ ایمان اور تقویٰ کو بنایا ہے۔ آسمان سے برکتوں کے دروازے بھی تبھی کھلتے ہیں جب بندے اللہ کی مرضی کو ترجیحِ اوّل بنالیں۔ خلافت راشدہ بہترین مثال ہے، وہاں ایمان وتقویٰ اور عمل صالح نے حالات کا دھارا موڑ دیا۔ غلبۂ اسلام کے لیے داخلی تزکیہ کے ساتھ ساتھ خارجی تزکیہ کی بھی ضرورت ہے۔ دینی غلبہ کے لیے دینی سیاسی جماعتوں کو ایک دوسرے کے خلاف محاذ کھڑا کرنے کی بجائے خیر کے کاموں میں مل جُل کر کام کرنا چاہیے۔ اگر سیکولر سیاسی جماعتیں دنیاوی مفاد کی خاطر اکٹھی ہوسکتی ہیں تو دینی جماعتوں کو بھی وسیع تر مفاد کے لیے سوچنا ہوگا۔

ڈاکٹر غالب عطا (پنجاب یونیورسٹی، لاہور)

میں ڈاکٹر امین صاحب کی سفارشات سے متفق ہوں تاہم دو باتیں مزید کہنا چاہتا ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کا مقصد تزکیہ تو تھا ہی مگر اسلام کا سیاسی غلبہ بھی تھا۔ ایک تعلیم اصحاب صفہ کی تھی اور دوسری دارارقم کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دونوں طرح کی تعلیم دی ہے۔ علامہ اقبال نے اپنے خطبات میں تعلیم کے تین مقاصد بیان کیے ہیں: ۱۔ تعلیم صبر پیدا کرے ۲۔ تعلیم فقر پیدا کرے ۳۔ تعلیم جرأت پیدا کرے۔ ہمارے آج کے نظامِ تعلیم میں یہ تینوں مقاصد شامل نہیں۔ تزکیہ کے ذریعے تیار کردہ افراد کا ریاست سے مکالمہ ضروری ہے تاکہ ریاست کا بھی تزکیہ ہو۔ ہمارے اس پروگرام کے مخاطب سیاستدان ہونے چاہئیں۔ ۹۹ فیصد لوگوں کا تزکیہ کرلیں مگر ایک فیصد سیاستدانوں کا تزکیہ نہ ہو تو تبدیلی نہیں آسکتی۔ اس جانب توجہ کی ضرورت ہے۔

ڈاکٹر حسن مدنی (پنجاب یونیورسٹی و مدیر جامعہ لاہور الاسلامیہ)

اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے جو دین قبول فرمایا ہے وہ مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ دین تمام تر لاگو کرنے کے لیے ہے، اپنی ذات پر بھی اور معاشرے پر بھی۔ دین کے پہلے نمونے صحابہ کرامؓ تھے جو دل کے پاک تھے، علم کے لحاظ سے کھرے تھے اور ہر طرح کے تکلف و تصنع سے پاک تھے۔ ہمارا معاشرہ اگر صحابہ کرامؓ کی سیرت کو نمونہ سمجھتے ہوئے آگے بڑھے تو پھر سے مسلمانوں کو عروج مل سکتا ہے۔ انہی بنیادوں کی طرف لوٹنے میں ہم سب مسلمانوں کی فلاح ہے۔

ڈاکٹر اختر حسین عزمی (سابق پروفیسر شعبہ علوم اسلامیہ)

احیائے امت کی فکر بہت اہم موضوع ہے۔ معاشرہ ہمارے ساتھ سے نکل رہا ہے۔ آج ہمارا مسئلہ فرقہ واریت اور قرآن سے دوری ہے۔ قرآن ہی ہمارے مسائل کا واحد حل ہے۔ مذہبی سیاسی جماعتیں مذہب کی بنیاد پر ووٹ نہیں لے سکیں۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ انہوں نے معاشرے کے لیول پر کام نہیں کیا۔ دنیا اور آخرت میں کامیابی کے لیے قرآن کے

فہم اور اس پر عمل کرنے کی ضرورت ہے۔

ڈاکٹر علامہ سرفراز احمد اعوان

آپ DHA کے ہیڈ خطیب رہے ہیں اور اب پنجاب یونیورسٹی میں پڑھا رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا ہماری ناکامی کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ پاکستانی معاشرہ کی تربیت نہیں ہوسکی۔ سوشل میڈیا جو علم پھیلا رہا ہے وہ نافع کم اور مضر زیادہ ہے۔ الحاد اسی سے پھیل رہا ہے۔ تربیت کے لیے ہم سب کو مسجد کو مرکز بنانے کی ضرورت ہے۔ مسجد کی وہ حیثیت جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے وضع کی تھی وہ اب باقی نہیں رہی، اسے بحال کرنا ازبس ضروری ہے۔ ہم نے مسجد کو صرف نمازیں پڑھنے کے لیے مختص کر رکھا ہے جبکہ یہ خیر القرون میں ہر خیر کا مرکز تھی۔ لوگوں کی عبادات ٹھیک کرنے کے ساتھ ان کی ایمانیات اور اخلاقیات کے لیے اہل خیر اور اہل علم مل کر مسجد کو مرکز بنائیں۔ قوم کی اگر اسوۂ رسول کے مطابق تربیت ہوگئی تو ان شاء اللہ پاکستان کو حقیقی پاکستان بننے سے کوئی نہیں روک سکے گا۔

ڈاکٹر شہزاد مجددی (دانشور و مربی)

احیاء اسلام کی کوشش بڑا کام ہے۔ یہ بہت اہم پیش رفت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا جس طرح لوہے کو زنگ لگ جاتا ہے اسی طرح دلوں کو بھی لگتا ہے۔ دلوں کا زنگ ذکر اللہ سے اتارا جاتا ہے جب کہ قومی بگاڑ سوچ بچار اور نئی حکمت عملی کا تعین کر کے تعلیم وتزکیہ کے ذریعہ دور ہوگا۔ جب بگاڑ بہت بڑھ جائے تو اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ شدید مشکلات کی بھٹی میں ڈال کر میل کچیل دور فرماتا ہے۔ سقوطِ بغداد میں لوگ اولیاء کے پاس دعا کے لیے عرض کرتے کہ بلا ٹلے۔ وہ فرماتے تھے کہ یہ لوگ خدا کے عذاب کا کوڑا بن کر نازل ہوئے ہیں۔ دعائیں بھی اسی لیے قبول نہیں ہوتیں۔ ضروری ہے کہ ہم سب اپنے اعمال کا محاسبہ کریں۔

ڈاکٹر محمد عارف خان (انگلینڈ میں مقیم دانشور)

میں ممنون ہوں ڈاکٹر محمد امین صاحب کا کہ انہوں نے مجھے اتنی خوبصورت مجلس میں مدعو کیا جہاں بہت سے اہلِ علم حضرات سے ملاقات ممکن ہوسکی۔ ایسے سیمینارز کا امتیاز یہ ہے کہ ان

میں عقیدہ پر بحث نہیں ہوتی بلکہ علمی بحث کے ذریعے خیر کے سفر کو جاری رکھا جاتا ہے اور فکری اختلاف کو برداشت کیا جاتا ہے۔ ہمیں مغرب کی بہت سی باتوں سے اختلاف کے باوجود ان کے اچھے کاموں کی تحسین بھی کرنی چاہیے۔ آج مغرب کی ٹیکنالوجی ہمارے گھر گھر میں ہے اور اسی کی بدولت ہماری یہ تمام علمی گفتگو لائیو ہزاروں لوگوں تک پہنچ رہی ہے تاہم یہ فکر ضرور ہونی چاہیے کہ ہم بھی ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہ بیٹھے رہیں بلکہ اپنی قوم کے جوانوں کو مستقبل کی بہتری کے لیے تیار کریں، نئے علوم وفنون سے استفادہ کریں اور ایک مضبوط امت بننے کے لیے خود کو قرآن سے جوڑیں۔

مولانا غضنفر عزیز (جمعیت علماء اسلام ف)

احیائے اسلام کے لفظ سے مجھے اختلاف ہے۔ اسلام ہمیشہ سے زندہ ہے تاہم مسلمان سوئے ہوئے ہیں، خواب غفلت میں اپنے مقاصد کو بھول گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے دین کی حفاظت خود کرنے پر قادر ہے مگر معاشرت جو فرد سے بنتی ہے اس میں افراد اپنے ایمانی تقاضے بھول گئے ہیں۔ انہیں پھر سے جگانے کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے ہم سب کو کام کرنا ہوگا۔ یہی بقا کا باعث بھی ہوگا، ان شاء اللہ۔

بقیہ: عصرِ حاضر میں احیائے اسلام کے تقاضے

ردّ فکر مغرب: دوسرے مغرب کی الحادی فکر وتہذیب اور اس کے علمبردار اسلام و مسلم دشمن مغربی ممالک کی بالادستی اور تحکم کو ردّ کر دیا جائے جو احیائے اسلام میں مانع ہیں۔

ہماری سوچی سمجھی رائے یہ ہے کہ ہم صرف اسی صورت زوال سے نکل سکتے ہیں جب ہماری سمجھ میں یہ بات آجائے کہ ہم مسلمانوں کے لیے دنیا میں عزت وراحت اور آخرت میں کامیابی کا واحد نسخہ انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اسلام پر اخلاص سے عمل کرنا ہے اور غیر اسلام خصوصاً مغرب کی الحادی فکر وتہذیب کو ترک اور ردّ کرنا ہے۔ اس سے فرد بھی بدلے گا اور اس کے ذریعے سے معاشرہ اور ریاست بھی اسلامی ہوگی اور مسلمان دنیا وآخرت دونوں میں کامیاب ہوسکیں گے، ان شاء اللہ۔

تفہیمِ دین

پروفیسر ڈاکٹر محمد امین

اسلام کا سیاسی نظام

'عوام کی اکثریت'(Democracy) کی بجائے اہلیت اور میرٹ (Meritocracy) کا قائل ہے

باعث تحریر آنکہ

حال ہی میں تحریک اسلامی (جماعت اسلامی سے الگ ہونے والے نعیم صدیقی مرحوم اور ان کے ہم نواؤں کی جماعت) کے ماہنامے 'نشور' میں جناب خالد محمود عباسی صاحب (سابق رہنما تنظیم اسلامی) کا ایک مضمون دیکھنے کو ملا جس میں انہوں نے اسلام کے سیاسی نظام پر گفتگو کرتے ہوئے خلافت کے نظام کو''خلافتِ عامہ'' کہا یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بعد نظامِ حکومت (خلافت) چلانا عامۃ المسلمین کا اختیار ہے۔ انہوں نے جو بات کہی وہ نئی نہیں بلکہ اصلاً یہ فکر مولانا مودودی کی ہے جنہوں نے عصر حاضر میں اسلام کے سیاسی نظام کے لیے تھیوڈیموکریسی (Theo-Democracy) کا نظریہ پیش کیا تھا یعنی مغربی جمہوریت جو عوام کی حاکمیت اور اکثریت پر مبنی ہوتی ہے اگر اس میں خدا/ مذہب/ اسلام کا ذکر ڈال دیا جائے یا اسے اسلامی اصولوں کے تابع کر دیا جائے تو یہ اسلامی ہو جاتی ہے۔ بعد میں انہوں نے اس کے لیے 'اسلامی جمہوریت' کی اصطلاح وضع کر لی۔ تنظیم اسلامی کے ڈاکٹر اسرار احمد مولانا مودودی کے نظریۂ اقامت دین کے قائل اور علمبردار تھے اور یہی حال 'تحریک اسلامی' کا ہے۔ انہیں اختلاف صرف جماعت کی انتخابی سیاست سے تھا اور ہے کیونکہ ان کے خیال میں اس سے نظام کو نہیں بدلا جا سکتا اور اسلام کو غالب نہیں کیا جا سکتا۔

اور یہ بات، اس سے ملتے جلتے مفہوم میں، قرار داد مقاصد میں بھی کہی گئی ہے جو اے کے بروہی وغیرہ نے مولانا مودودی کی رائے کو پیش نظر رکھتے ہوئے تیار کی تھی (بروہی صاحب نے بعد میں اقرار کیا کہ انہوں نے قرارداد کا مسودہ مولانا کو جیل میں دکھا کر گویا ان کی 'منظوری' لے لی تھی) جس میں کہا گیا ہے کہ اللہ کی حاکمیت بالواسطہ طور پر ریاست کو حاصل

ہوگی جو عوام کے منتخب نمائندوں کے ذریعے اسے بروئے کار لائے گی۔ بہت سے اہل علم قراردادِ مقاصد کی اس پہلو سے مخالفت کرتے رہے ہیں اور کرتے ہیں دیکھیے خصوصاً محمد اکرم خان سوری کی کتاب ''قرارداد مقاصد میں وائرس''۔

راقم آثم بھی اپنی شعوری اور فکری زندگی کی ابتداء میں، جب وہ مولانا مودودی کی فکر سے متاثر تھا، اسی رائے کا اظہار کرتا رہا ہے لیکن عرصہ ہوا وہ مولانا کی رائے سے رجوع کر چکا ہے اور مغربی فکر و تہذیب کے بارے میں بھی اس کی رائے بدل چکی ہے۔ کئی دفعہ خیال آیا کہ نئے سرے سے عصرِ حاضر میں اسلام کے سیاسی نظام کے بارے میں لکھوں، ایک دفعہ تو شروع بھی کر دیا اور ساتھ ستر صفحے لکھ دیے لیکن دیگر دینی مصروفیات کی کثرت اور بعض دوسری ترجیحات کے پیش نظر اس کی تکمیل کے لیے وقت نہ نکال سکا۔ یہ مضمون پڑھ کر خیال آیا کہ کم از کم اس موضوع پر ایک مضمون لکھ دوں کہ 'خلافتِ عامہ' یا خلافتِ جمہور یا عامۃ الناس کی سیاسی بالادستی اور اسلامی حکومت کی تشکیل میں عامۃ الناس کے بنیادی کردار کا مؤقف درحقیقت معاصر علماء نے اور مولانا مودودی نے مغربی تہذیب کی سیاسی فکر اور جمہوریت سے لیا ہے۔ قرآنی نصوص، نبی کریم ﷺ کی سنت، صحابہؓ کے عمل اور مسلم سیاسی مفکرین کی تحریروں سے اس کی تصویب نہیں ہوتی۔ آگے بڑھنے سے پہلے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ دو ضمنی باتوں کی طرف اشارہ کر دیں۔

ایک: یہ کہ خالد محمود عباسی صاحب کی یہ بات خلافِ واقعہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے خلافت/ نظام حکومت کا معاملہ عامۃ المسلمین پر چھوڑ دیا تھا اور اسے کسی خاص قبیلے یا فرد کا حق قرار نہیں دیا تھا۔ ان کی یہ بات صریحاً اس صحیح حدیث کے خلاف ہے جس میں آپ ﷺ نے فرمایا تھا کہ "لا یزال ھذا الامر فی قریش ما بقی منھم اثنان"[۱] اور اسی حدیث کی بناء پر انصار نے سقیفہ بنی ساعدہ میں اپنے آدمی کو خلیفہ بنانے کی رائے واپس لے لی تھی حالانکہ وہ انصاری رہنما حضرت سعد بن عبادہؓ کی بیعت پر متفق ہو چکے تھے۔ دوسرے اہل سنت کا اس بات پر اجماع ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ افضل البشر بعد الانبیاء ہیں اور اس کی ایک وجہ وہ یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ اگرچہ نبی کریم ﷺ نے صراحت کے ساتھ خلافت کے لیے حضرت ابوبکرؓ کا نام نہیں لیا تھا لیکن ایسے کئی قرائن موجود تھے جن سے پتا چلتا تھا کہ

[۱] صحیح البخاری، رقم الحدیث: ۱۴۰۷

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے بعد حضرت ابوبکرؓ ہی کو اس کا اہل سمجھتے تھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ جب انصار نے "الائمہ من القریش" والی حدیث سنی اور حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ کے بارے میں وہ قرائن بیان کیے تو وہ دعویٔ خلافت سے دست بردار ہو گئے اور یہ طے پا گیا کہ خلیفہ مہاجرینِ قریش میں سے ہوگا تو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فوراً حضرت عمرؓ کا ہاتھ پکڑا اور کہا کہ میں آپ کی بیعت کرتا ہوں۔ لیکن حضرت عمرؓ نے فوراً اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ سے چھڑایا اور کہا کہ آپ کے ہوتے ہوئے مَیں اس کا اہل نہیں ہوں اور ان کا ہاتھ پکڑ کر بیعت کا اعلان کر دیا پھر حضرت ابوعبیدہؓ نے جو پاس کھڑے تھے، حضرت ابوبکر صدیقؓ کی بیعت کی اور پھر دیگر مہاجرین وانصار نے، جو اس وقت وہاں موجود تھے، حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کر لی۔ پھر بعد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تدفین کے بعد عامۃ المسلمین نے مسجد نبوی میں حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کی۔

دوسرے: مولانا مودودی نے اگرچہ 'اسلامی جمہوریت' کا نظریہ وضع کیا تھا لیکن پاکستان کے انتخابات اور حکومت سازی کے حالات دیکھ کر اور ۱۹۷۰ء کے الیکشن میں جماعت اسلامی کی زبردست شکست کے بعد اپنی رائے سے رجوع کر لیا تھا۔ ان کے پبلک بیانات بھی موجود ہیں۔ جماعت کی شوریٰ میں انہوں نے یہ تسلیم کیا (جماعت اس شوری کی کاروائی کو چھپاتی ہے لیکن جو ذمہ دار لوگ اس وقت شوریٰ میں موجود تھے، ان میں سے ایک مولانا وسیع مظہر ندوی مرحوم جو صوبہ سندھ کی جماعت کے امیر رہے تھے اور شوریٰ کے رکن تھے انہوں نے مولانا مودودی کے یہ الفاظ نقل کیے ہیں کہ ''ایک آدمی ایک ووٹ کا اصول مان کر مَیں نے غلطی کی تھی ....''۔ مولانا ندوی کی تحریر اور ان کے خطوط مولانا مودودی کے نام روزنامہ نوائے وقت، ماہنامہ البرہان اور کئی دوسری جگہ شائع ہو چکے ہیں۔ لیکن اُس وقت کی جماعت کے قائدین نے مولانا مودودی کا مؤقف تسلیم نہ کیا اور چونکہ مولانا بڑھاپے اور بیماریوں کے ہاتھوں کمزور اور لاچار ہو چکے تھے اور نئے سرے سے جدوجہد نہیں کر سکتے تھے اس لیے انہوں نے اس جماعت کو اختلافات کا شکار نہ کرنے کا فیصلہ کیا جسے انہوں نے ساری زندگی کی محنت سے قائم کیا تھا اور خاموشی اختیار کر لی اور بعد میں راہیٔ ملکِ عدم ہوئے۔ [۱]

---

[۱] تفصیل کے لیے دیکھیے البرہان کا شمارہ ستمبر ۲۰۱۸ء کا خصوصی نمبر جو جماعت اسلامی کی شکست کے اسباب پر تفصیلی تجزیہ ہے جو نیٹ پر بھی موجود ہے۔ (لنک https://alburhaan.pk) اور کتابی شکل میں بھی مکتبہ البرہان سے دستیاب ہے۔

خیر یہ دو باتیں ہم نے ضمناً ذکر کر دیں، اب ہم اصل موضوع کی طرف آتے ہیں کہ قرآن حکیم، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت، خلفاء راشدین کا عمل اور امت کے سیاسی مفکرین کسی نے اسلام اور مسلمانوں کے سیاسی نظام میں عوام کی کثرت کو سیاسی نظام اور تشکیل حکومت میں وہ فیصلہ کن حیثیت نہیں دی جو مغربی جمہوریت نے دی ہے اور ہمارا مؤقف یہ ہے کہ معاصر علماء، خصوصاً مولانا مودودی نے یہ رائے مغرب کے سیاسی نظام سے لی ہے اور اس سے مرعوبیت کی وجہ سے اختیار کی ہے اور غلط کیا ہے کیونکہ یہ قرآن وسنت کی نصوص اور مقاصد شریعت کے خلاف ہے۔ اس کے برعکس قرآن وسنت اور تعاملِ امت اہلیت اور میرٹ پر اصرار کرتے ہیں جیسا کہ مندرجہ ذیل تفصیلات سے ظاہر ہے:

قرآن حکیم کی تعلیمات

* امانتیں ان لوگوں کے حوالے کرو جو اس کے اہل ہوں۔ امانتوں میں ہر قسم کی ذمہ داریاں (سیاسی وانتظامی شامل ہیں)۔

﴿إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمٰنٰتِ إِلٰى أَهْلِهَا﴾[النساء۴:۵۸]

* جو طاقت ور اور امانت دار ہوں

﴿إِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَأْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْأَمِيْنُ﴾[القصص۲۸:۲۶]

* جو صاحبِ علم اور صحت مند ہوں

﴿بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ﴾[البقرہ۲:۲۴۷]

* دنیا میں اکثر لوگ ہدایت پر نہیں، فاسق ہیں

﴿وَإِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ لَفٰسِقُوْنَ﴾[المائدہ۵:۴۹]

﴿وَتَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُوْنَ فِي الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ﴾[المائدہ۵:۴۹]

''اور تم دیکھو گے کہ ان میں اکثر گناہ اور زیادتی اور حرام کھانے میں جلدی کر رہے ہیں۔''

* اگر تم اکثریت کا اتباع کرو گے تو گمراہ ہو جاؤ گے

﴿وَإِنْ تُطِعْ أَكْثَرَ مَنْ فِي الْأَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ إِنْ يَّتَّبِعُوْنَ

اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ﴿۱۱۶﴾ [الانعام ۶:۱۱۶]

''اور یاد رکھو اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لوگوں کی اکثریت پر چلیں گے تو وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی اللہ کے راستے سے بھٹکا دیں گے۔ وہ محض گمان کی پیروی کرتے اور قیاس آرائیاں کرتے ہیں۔''

سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے مشاورت کا حکم دیا:

﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ﴾ [آل عمران ۳:۱۵۹]

تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اکثر کبار صحابہؓ سے مشورہ کیا کرتے تھے خصوصاً حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ سے جیسا کہ جنگ بدر کے قیدیوں کے بارے میں دونوں کا مؤقف معروف ہے۔[۱] یا شیوخ قبیلہ و سربراہان برادری سے مشورہ کرتے تھے۔ جیسا کہ آپ نے قبیلہ ہوازن کے قیدیوں کی رہائی کے سلسلے میں کیا[۲]۔ صلح حدیبیہ سے صحابہ کرام دل برداشتہ تھے (کیونکہ بظاہر وہ سمجھ رہے تھے کہ انہیں شکست اور ہزیمت ہوئی ہے۔ وہ عمرہ نہیں کر سکے اور انہیں دب کر صلح کرنی پڑی ہے) اور صدمے کی کیفیت میں تھے چنانچہ جب آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے انہیں سر منڈانے، احرام کھولنے اور واپسی کا حکم دیا تو وہ صدمے کی کیفیت میں اور متذبذب ہونے کی وجہ سے آپ کی ہدایت پر فوری عمل نہ کر سکے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو صدمہ ہوا اور آپ نے اپنی اہلیہ محترمہ اُم سلمہؓ سے مشورہ کیا تو انہوں نے کہا کہ صحابہ کرام صدمے اور تذبذب کی کیفیت میں ہیں۔ آپ حجام کو بلوا کر بال کٹوائیں اور احرام کھول دیں تو مسلمان بھی ان شاء اللہ آپ کی اطاعت کریں گے چنانچہ ایسا ہی ہوا[۳]۔ بدر کے معاملے میں بھی جب واضح ہو گیا کہ اب قریش سے لڑنا پڑے گا تو آپ نے انصار و مہاجرین کے زعماء سے مشورہ کیا۔[۴]

خلاصہ یہ کہ آپ اپنے عہد کے ذمہ دار، عاقل، سنجیدہ، سربرآوردہ اور شیوخِ قبیلہ

---

[۱] مسند احمد بن حنبل

[۲] بخاری ج ۱ ص ۳۴۵ باب من ملک من العرب

[۳] صحیح بخاری، رقم الحدیث: ۲۷۳۱

[۴] وھبہ الحیلی، الشوریٰ فی اسلام، صفحہ ۷۸، مؤسسۃ مآب، عمان (اردن)

واصحاب اولی الامر ومدبران سے مشورہ کرتے تھے، عامۃ الناس سے مشورہ نہ کرتے تھے اور غزوہ احد کے آغاز میں جب آپ نے مجلس میں موجود سب لوگوں یعنی عامۃ الناس سے مشورہ کیا تو آپ کو پختہ اور صحیح رائے نہ ملی (یعنی کھلے میدانِ جنگ میں مقابلہ کرنے کی) تو آپ کو اور مسلمانوں کو جانی ومالی نقصان اٹھانا پڑا۔(۱)

ایک صحابی نے ایک دفعہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا کہ اگر آپ کی غیر موجودگی میں ہمیں کوئی نیا مسئلہ پیش آجائے تو ہم کیا کریں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب دیا کہ متقی اہل علم سے مشورہ کرو اور کسی ایک فرد کی رائے پر عمل نہ کرو۔(۲)

ان مثالوں اور واقعات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وحی نازل ہونے کے باوجود محدثات میں مسلمانوں سے مشورہ کرتے تھے لیکن وہ مشورہ اپنے ان اصحاب سے کرتے تھے جو آپ کے اولوالعزم ساتھی تھے، جنہوں نے عمر بھر آپ کا ساتھ دیا تھا، جو عالم، فاضل، عاقل، سربرآوردہ، سنجیدہ اور صاحبِ الرائے تھے اور آپ مشورہ عامۃ الناس سے نہیں کرتے تھے۔

تعامل خلفاء راشدین

تعین خلیفہ کے اہم ترین معاملہ کو لیجیے کہ سقیفہ بنوساعدہ میں جب انصار نے خلیفہ اپنے میں سے چن لیا تھا تو مہاجرین کے سرکردہ لوگ وہاں پہنچے اور یہ حدیث سنائی کہ ائمہ قریش میں سے ہوں گے (یعنی خلیفہ عام لوگوں میں سے نہیں ہوگا) تو مہاجرین اور انصار میں سے جتنے قائدین موجود تھے، سب نے حضرت ابوبکرؓ کو خلیفہ منتخب کرلیا اور آپ کی بیعت کرلی۔ پھر دوسرے دن عامۃ الناس نے مسجد میں آپ کی بیعت کی(۳)۔ حضرت عمرؓ کی بطور خلیفہ تعیناتی کے وقت بھی یہی ہوا کہ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کو خلیفہ نامزد کرنے کا فیصلہ کیا اور اصحاب شوریٰ سے اس پر مشورہ کیا اور انہیں اس کی افادیت کا قائل کیا۔ جب یہ ہوگیا تو پھر عامۃ الناس

---

(۱) مسند احمد، ۳/ ۳۵۱

(۲) سنن دارمی

(۳) تاریخ جریر طبری، ۲/ ۴۵۵

نے مسجد میں سے حضرت عمرؓ کی بیعت کی[۱]۔ حضرت عثمانؓ کی تعیناتی کے وقت بھی یہی ہوا کہ حضرت عمرؓ نے اپنے مرض الموت میں چھ قریشی قائدین پر مشتمل ایک کمیٹی بنا دی جس نے اپنے میں سے حضرت عثمانؓ کو چن لیا[۲]۔ حضرت علیؓ کی تعیناتی کے وقت بھی یہی ہوا کہ جب سیاسی انتشار پھیل گیا تو عامۃ الناس حضرت علیؓ کے پاس گئے کہ آپ حکومت سنبھالیں لیکن آپ نے انکار کر دیا اور کہا کہ تمہارے کہنے پر تو نہیں البتہ بدری صحابہ اور اصحابِ شوریٰ اگر آ کر کہیں تو مَیں ذمہ داری سنبھال لوں گا۔ چنانچہ جب اصحابِ بدر وشوریٰ نے آ کر آپ سے درخواست کی تو آپ نے خلافت کی ذمہ داری قبول کی، پھر عامۃ الناس نے بیعت کی[۳]۔

خلاصہ یہ کہ خلفاء راشدین کی تعیناتی میں بنیادی کردار عالم، مدبر، سربراہان قبیلہ وسرکردہ لوگوں کا ہاتھ تھا، جنہیں بعد میں اہل الحل والعقد کا لقب دیا گیا، نہ کہ عام لوگوں کا۔

یہ بھی واضح رہے کہ سارے خلفاء راشدین کی ایک شوریٰ تھی جو اپنے عہد کے جلیل القدر صحابہ جو معاشرے کے چنیدہ عالم، عاقل، مدبر، فقیہ اور معاشرے کے سرکردہ لوگ تھے۔

مسلم مفکرین

جن مسلم مفکرین، مصلحین اور مصنفین نے علم السیاست پر لکھا ہے ان سب کی رائے یہ ہے کہ خلیفہ کے تعین اور عزل کا اختیار اہل الحل والعقد کے پاس ہے۔[۴] مشہور صحابی حضرت عبداللہ بن ابیؓ نے اس میں 'امراء'[۵] کا شمار کیا ہے یعنی صوبوں کے گورنر وغیرہ[۶] جبکہ امام

---

[۱] صحیح البخاری، رقم الحدیث: ٦٦١٥

[۲] صحیح البخاری، رقم الحدیث: ۳۵۵۳

[۳] طبری، ۴/ ۴۲۷

[۴] ابوالحسن علی الماوردی، الاحکام السلطانیۃ والولایات الدینیہ، مکتبہ دار ابن قتیبہ، الکویت، صفحہ: ٦
امام احمد بن حنبل، العقیدہ، صفحہ ۱۲۴، دار قتیبہ، دمشق، ۱۴۰۸ھ
ابن خلدون، المقدمہ، صفحہ ۱۰۳، ۲۰۰، دار القلم بیروت، ۱۹۸۴ء

[۵] سنن النسائی، رقم الحدیث: ۸۰۸، قال الالبانی: صحیح

[٦] ابن الاثیر، النہایہ فی غریب الحدیث، جلد ۳، صفحہ ۲۷۰، المکتبۃ العلمیۃ بیروت ۱۳۹۹ھ

ابن تیمیہؒ نے ان کے لیے اصحاب ''الشوکا'' سے تعبیر کیا ہے۔[۱] شارح بخاری ابن بطال کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے انتخابِ خلیفہ کے لیے جو کمیٹی قائم کی تھی وہ بھی اہل الحل والعقد کی تھی۔[۲]

مطلب یہ کہ اہل الحل والعقد فیصلہ کرتے تھے کہ کس کو خلیفہ ہونا چاہیے، پھر اس پر عوام کی رائے (بیعت کی صورت میں) تصویب اور تائید کے لیے لی جاتی تھی۔ اور شاذ و نادر ہی ایسا ہوا ہے کہ عامۃ الناس اس طرح کے اہل الحل والعقد کے فیصلے کو رد کر دیں کیونکہ امہ کے قائدین کے اتفاق کے بعد اس امر کی گنجائش عموماً نہیں رہتی کہ عامۃ الناس کثرت سے اس کی مخالفت کریں۔ اِکّا دُکّا اور واقعات سے ظاہر ہے کہ معاملے پر فرق نہیں پڑنا جیسے حضرت سعد بن عبادہؓ نے حضرت ابوبکرؓ کی بیعت نہیں کی اور شروع میں حضرت علیؓ نے بھی نہ کی تھی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ خلافتِ راشدہ کے بعد تعینِ خلیفہ کا انحصار وراثت پر ہو گیا اور بیعت عامۃ الناس کی شکل گو باقی رہی لیکن وہ حقیقی سپرٹ سے خالی ہو گئی۔ ایک خلیفہ کی اپنے بعد آنے والے خلیفہ کی نامزدگی بھی غیر شرعی نہیں جیسا کہ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کو نامزد کیا تھا اور حضرت عمرؓ نے چند افراد کی ایک کمیٹی نامزد کر دی تھی۔ خلیفہ سلیمان بن عبدالملک نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو نامزد کر دیا تھا اور وہ بہترین اسلامی خلیفہ ثابت ہوئے بلکہ امت انہیں پانچواں خلیفہ راشد کہتی ہے۔ تاہم جب یہ نامزدگی وراثت کی بنیاد پر ہونے لگی اور میرٹ پر نہ رہی تو اس کی شکل تو باقی رہی لیکن یہ روح سے خالی ہو گئی۔

انتخاب حاکم بذریعہ اہل الحل والعقد کی مسلم روایت اتنی مستحکم ہے کہ انسانی تاریخ کا ایک حصہ بن گئی چنانچہ اس وقت مغرب میں جو جمہوری نظام ہے، اس کی دو بڑی قسمیں ہیں: ایک صدارتی اور دوسرے پارلیمانی۔ پارلیمانی نظام میں صدر کو قومی و صوبائی اسمبلیوں کے ارکان منتخب کرتے ہیں گویا ان ارکان اسمبلی کی حیثیت اہل الحل والعقد کی سی ہے۔

اسلامی روایت میں میرٹ کی اہمیت اور تعامل

۱۔ اللہ تعالیٰ نے میرٹ کا لحاظ رکھا جب آخری رسول کے لیے جزیرہ نما عرب کا انتخاب

---

[۱] ابن تیمیہ، منہاج السنہ، جلد ۱، صفحہ ۵۲۷

[۲] ابن بطال فی شرحہ علی البخاری، جلد ۸، صفحہ ۲۷۵، مکتبۃ الرشد الریاض، ۱۴۲۳ھ

کیا، پھر جزیرہ نما عرب میں سے شہر مکہ کا انتخاب کیا۔ پھر عرب کے مختلف قبائل میں سے قریش کا انتخاب کیا اور قریش میں سے بنو ہاشم کا اور بنو ہاشم میں سے عبد المطلب کے پوتے کا۔ مورخین نے اس انتخاب کے میرٹ پر ہونے کے بارے میں بیسیوں صفحات لکھے ہیں۔

۲۔ پھر اللہ تعالیٰ نے آخری نبی حضرت محمد مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا انتخاب کیا تو میرٹ پر، پھر ان کی تعمیر شخصیت کا انتظام کیا۔ ان کے دل کو پاک وصاف رکھنے کے لیے کئی روحانی آپریشن کیے گئے۔ [۱] انہیں یتیم پیدا کیا، انہیں عسرت کا ماحول دیا، مکہ میں ان سے بکریاں چروائیں، ان کی جوانی کو پاک رکھا، نبوت سے پہلے بھی بہترین اخلاق دیے اور جب انہوں نے صفا کی پہاڑی پر کھڑے ہو کر قوم کو پکارا تو کسی نے انہیں مانا یا نہ مانا لیکن کوئی ان کے کردار پر انگلی نہ اٹھا سکا۔ آپ کی ساری زندگی ایک ایسے معصوم و پاکباز، مدبر، منتظم، حاکم، سیاسی رہنما، عسکری قائد، بہترین خاوند اور شفیق باپ کی ہے جس کی مثال انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ یہاں تک کہ ایک کافر (مائیکل ہارٹ) جب دنیا کے سب سے مؤثر اور سب سے لائق، کامیاب اور دنیا کو مثبت انداز میں بدلنے والوں کا انتخاب کرنے بیٹھا تو اسے پہلا نمبر محمد مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو دینا پڑا۔

۳۔ آپ نے ایسے افراد تیار کیے کہ پتھروں کو تراش کر ہیرے بنا دیے۔ آپ نے ۱۳ سال کی سخت محنت سے مکہ میں جو افراد تیار کیے ان میں بدر میں شامل ہونے والوں کی تعداد ۸۰ تھی اور کل تعداد ۳۱۳ تھی اور یہی آپ کے ساتھ مل کر دنیا کا سب سے بڑا انقلاب لائے۔ ان کے مؤثر ہونے کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہو سکتا ہے کہ ۲۰ سال سے کم عرصے میں روم و ایران کی سپر پاورز خلفاء راشدین کے قدموں میں تھیں اور ایک یورپی کو کہنا پڑا کہ اگر مسلمانوں میں ایک اور عمرؓ ہوتا تو تا قیامت مسلمانوں کی حکومت ختم نہ ہوتی۔

۴۔ سقیفہ بنو ساعدہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کے مطابق امیر قریش میں سے ہوا اور اس وقت موجود مہاجرین و انصار نے قریش کے بہترین آدمی کا انتخاب کیا جسے امت کا سوادِ اعظم افضل البشر بعد الرسل تسلیم کرتا ہے۔ اُس زمانے میں قریش کے اہل تر ہونے کا اس سے بڑا

---

[۱] احادیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے شق صدر کے کئی واقعات بیان ہوئے ہیں۔ دیکھیے مثلاً صحیح مسلم، رقم الحدیث: ۱۶۲

ثبوت اور کیا ہوسکتا ہے کہ خلافتِ راشدہ، پھر بنو امیہ اور پھر بنو عباس کے ادوار میں ان کی حکومت پانچ سو سال تک باقی رہی۔

۵۔ حضرت معاویہؓ نے اپنے بیٹے یزید کو نامزد کیا تو اس سے آپ کے پیشِ نظر سیاسی استحکام تھا۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد جنگیں ہوئیں جن کے پس پشت بنوامیہ و بنو ہاشم کی پُرانی باہمی چپقلش تھی چنانچہ حضرت معاویہؓ نے مسلم معاشرے کو اس کشمکش سے بچانے کے لیے اپنی زندگی میں یزید کی بیعت لی تاکہ بعد میں خلافت پر جھگڑے نہ ہوں۔ بعد میں یزید اور اس کے والیوں نے جو کچھ کیا، ظاہر ہے وہ حضرت معاویہؓ کی وفات کے بعد ہوا۔ ان کے اندازے کی غلطی ہوسکتی ہے لیکن صحابی ہونے کی حیثیت سے ہم ان کے حسن نیت پر شک نہیں کرسکتے۔ پھر یہ بھی دیکھیے کہ حضرت معاویہؓ کی قائم کردہ حکومت ایک سو سال تک باقی رہی جو بڑی حد تک اسلامی تھی۔ اس نے ملک کو سیاسی استحکام دیا اور ہمہ نوع حربی، سماجی، معاشی، ترقی کا سفر جاری رہا، مزید علاقے فتح ہوئے (بشمول سندھ) اور نظم ونسق بہترین اور معاشرہ خوش حال تھا۔

۶۔ مسلمان ایک ہزار سال تک دنیا کے حکمران رہے تو وہ دنیا میں میرٹ پر سب سے آگے تھے۔ مسلم ممالک میں سیاسی استحکام تھا، مضبوط ترین فوجیں تھیں، نظم ونسق نہایت اعلیٰ تھا، عدل و انصاف کا دور دورہ تھا۔ تعلیم، تربیت، تحقیق کا انتظام مثالی تھا۔ مسلمان سائنس وٹیکنالوجی میں بھی دنیا سے آگے تھے۔ بین الاقوامی تجارت اپنے جوبن پر تھی۔ اگر یہ سب نہ ہوتا اور مسلمان میرٹ پر دنیا سے آگے نہ ہوتے تو چند سالوں میں دنیا انہیں مغلوب کرلیتی جیسا کہ جب وہ میرٹ پر نہ رہے تو مغلوب ہوگئے اور جو میرٹ پر، صلاحیت میں ان سے آگے تھے، یعنی اہل مغرب انہوں نے انہیں دبالیا اور محکوم بنالیا۔

تو خلاصہ یہ کہ اسلام کا نظامِ حیات اور خصوصاً سیاسی نظام صالحیت اور صلاحیت اور میرٹ وکمال (Excellence) پر یقین رکھتا ہے کہ جو کام بھی کرو، بہترین انداز میں کرو۔ قرآن حکیم نے فرمایا کہ کہف والے جب سیکڑوں سال سو کر اٹھے تو انہوں نے اپنے میں سے ایک کو قریبی شہر میں کھانا لانے کے لیے بھیجا تو اسے کہا کہ 'بہترین کھانا لانا' [1] اور نبی

[1] الکہف ۱۸:۱۹

کریم ﷺ کو اس Excellence کا اتنا اہتمام تھا کہ فرمایا کہ ہر کام بہترین طریقے سے کیا کرو یہاں تک فرمایا کہ جانور کو ذبح کرنے سے پہلے چھری تیز کرلیا کرو[۱]۔ حدیث جبریل میں آپ ﷺ نے 'احسان' کا جو ذکر کیا وہ عبادت تک محدود نہیں تھا بلکہ سارے اعمال (عبادت واطاعت) اس میں شامل ہیں اور احسان کا مطلب یہ ہے کہ عبدیت کے سارے کام اپنی بہترین صورت وکیفیت یعنی Excellence سے انجام دیے جائیں اور اسی کے لیے آپ (ﷺ) نے صحابہ کرام کو تیار کیا۔ اور صحابہ کرام نے اپنے بعد والی نسل کو اور اس نے اپنے بعد آنے والوں کو و قِس علی ذلك۔

خلاصہ یہ کہ مسلمانوں کا سیاسی نظام Excellence پر مبنی تھا۔ اس میں عامۃ الناس کی بجائے امت کے چیندہ عالم، لائق، مؤثر، صالح، تجربہ کار اور سرکردہ افراد کا کردار زیادہ تھا۔ عوام کی حمایت بھی اہم تھی لیکن اس کی حیثیت ثانوی تھی۔

مغرب میں عوام کا نام زیادہ استعمال ہوتا ہے ورنہ وہاں بھی اشرافیہ ہی زیادہ مؤثر ہے اور درحقیقت اقلیت ہی اکثریت کے نام پر حکومت کرتی ہے۔ عوام کا نام اس لیے استعمال ہوتا ہے کہ وہاں دین، مذہب، وحی اور اللہ تعالیٰ کی بالادستی کی بجائے فرد کو خدا کا درجہ دیا گیا ہے (ہیومنزم) لہٰذا جب فرد خود مختار بلکہ مختار مطلق ہے تو یہی حیثیت اس کے نمائندوں کی ہوگی۔ اسی لیے وہاں پارلیمنٹ کو سپریم کہا جاتا ہے کیونکہ خدائی اختیارات رکھنے والے افراد کے نمائندہ پارلیمنٹ میں جو قانون چاہے بنا سکتے ہیں، جس چیز کو چاہیں حلال یا حرام قرار دے سکتے ہیں اس لیے کہ وہ ان افراد کے نمائندے ہیں جو اپنی اصل میں بالادست ہوتے ہیں اور اپنے سے بالاتر کسی ہستی (خدا) کو وہ نہیں مانتے۔ لیکن ظاہر ہے کہ مغرب کے سیاسی نظام کے اس پہلو کو نہ تو ہم اسلامی کہہ سکتے ہیں اور نہ مسلم معاشرے میں اس کی پیروی کر سکتے ہیں لہٰذا عوام کی بالادستی اور جمہوریت یا اسلامی جمہوریت کے نام پر اسلامی ممالک میں جو کچھ کیا جاتا ہے، وہ نظر کا دھوکہ ہے، اس کا کوئی جواز نہیں اور وہ اصلاً خلافِ اسلام ہے۔ ھذا من عندی والعلم عنداللہ۔

---

[۱] سنن النسائی، رقم الحدیث: ۴۴۱۰

تفہیم دین

ڈاکٹر حسیب احمد خان

ردِّ الحاد و دہریت پر اُردو زبان میں لکھی گئی کتب

اکثر یہ مطالبہ کیا جاتا ہے کہ رد الحاد پر اردو زبان میں لکھی گئی کتب کی فہرست شائع کی جائے۔ مَیں اسے مفید نہیں سمجھتا اور میری رائے یہ ہے کہ جب تک کوئی تین بنیادی امور سے واقف نہ ہو اسے ان عنوانات کو نہیں پڑھنا چاہیے:

اولاً: اسلامی عقائد کسی مستند عالم دین کی نگرانی میں پڑھے جائیں۔

دوم: نبی کریم ﷺ کی سیرت مبارکہ، اصحاب رسول رضوان اللہ علیہم اجمعین اور سلف صالحین کی سوانح مطالعے میں رکھی جائیں۔

سوم: قرآن وسنت کے منتخب عنوانات باقاعدہ سیکھے جائیں۔

اس کے بعد الحاد کے پیچھے موجود لامذہبی نظریات کا مطالعہ کرنا چاہیے جن میں مادیت، تشکیک، انسانیت پرستی، سائنس پرستی، تجدد پسندی، جدیدیت، لبرلزم، سیکولرزم، انکار حدیث، دفاعِ ناموسِ رسالت و اہل بیت اور امہات المومنینؓ، دفاع صحابہؓ وغیرہ۔

پھر باری آتی ہے الحاد کے اس پہلو کی کہ جس کا تعلق دہریت کے ساتھ یعنی انکار خدا کے ساتھ ہے اس کے بھی دو بنیادی دائرے ہیں:

اولاً: ماہرین اس سے پہلے علم الکلام اور فلسفے کے بنیادی موضوعات کا مطالعہ کریں۔

دوم: عام طالب علم ایسی مفید کتابوں کا مطالعہ کریں جو فکری اعتبار سے الحاد و دہریت کے خلاف ان کی ذہن سازی کر سکیں۔

یہاں پر ہم عام طالب علموں کے لیے چند کتب کی فہرست پیش کر رہے ہیں:

۱۔ اسلام اور عقلیات (شرح الانتباہات المفیدۃ عن الاشتباہات الجدیدۃ)

یہ مولانا اشرف علی تھانویؒ کے معروف رسالے 'الانتباہات' کی شرح ہے جسے مولانا مصطفیٰ خان بجنوریؒ نے ترتیب دیا ہے۔ اس کتاب میں حضرت تھانویؒ نے جدید علم الکلام کا

عطر نکال کر رکھ دیا ہے اور الحادی فکر کی بنیادوں پر گفتگو کی ہے۔

۲۔ الدین القیم

یہ سید مناظر احسن گیلانیؒ کی شاہکار کتاب ہے جس میں دین کے مابعد الطبیعیاتی امور پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔

۳۔ علم الکلام

اس عنوان پر بہت سے لوگوں نے کتب لکھی ہیں لیکن الحادی طرز فکر کے تناظر میں مولانا ادریس کاندھلویؒ کی یہ کتاب ایک شاہکار ہے۔

۴۔ لامذہبی دور کا تاریخی پس منظر

مولانا محمد تقی الدین امینیؒ کی یہ کتاب لامذہبی افکار وتہذیب کے تاریخی پس منظر کی بابت ایک شاندار مطالعہ ہے۔

۵۔ جدیدیت

پروفیسر حسن عسکری مرحوم کی یہ کتاب لامذہبی افکار وتہذیب کا ایک اجمالی خاکہ ہے۔ اسے اگر کسی مستند استاد سے پڑھا جائے تو یہ انتہائی مفید رہے گی۔

۶۔ تالیفات علامہ شبیر احمد عثمانی

علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کے رسائل کا مجموعہ دور جدید کے عقل پرستوں کے لیے بہت مفید ثابت ہوگا۔ اس میں اسلام کے ان امور سے متعلق شاندار گفتگو ہے جن پر دورِ جدید کا ذہن اعتراضات اٹھاتا ہے۔

۷۔ تنقیحات

یہ سید مودودی مرحوم کا رسالہ ہے اور جدید مغربی فکر وتہذیب کی مبادیات کو سمجھنے کے لیے بہت مفید ہے۔

۸۔ کیا خدا ہے؟ ہاں خدا ہے!

یہ مفتی عبدالحکیم سکھرویؒ کے دو رسائل ہیں جو خاص اس عنوان پر انتہائی مفید ہیں۔ ان

کے مطالعے سے وجودِ باری تعالیٰ کی بابت بہت سے بنیادی امور کی وضاحت ہو جاتی ہے۔

۹۔ انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر

۱۰۔ معرکہ ایمان و مادیت

۱۱۔ مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش

یوں تو سید ابوالحسن علی ندویؒ کی تمام ہی کتب طالبانِ علم کے لیے بہت مفید ہیں لیکن خاص اس عنوان پر الحاد و دہریت کے خلاف کام کرنے والے طالب علموں کے لیے ان تین کتب کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔

۱۲۔ سائنسی میدان میں مسلمانوں کا عروج و زوال

۱۳۔ اسلام اور جدید سائنس

۱۴۔ قرآن مجید اور دنیائے حیات - جدید سائنس کی روشنی میں چند حقائق

مولانا شہاب الدین ندویؒ کی یہ کتب الحاد و دہریت کے باب میں سائنس پرستوں کے اعتراضات کے حوالے سے بہت مفید ہیں۔

۱۵۔ تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ

علامہ اقبال مرحوم کے خطبات کا سید نذیر نیازی مرحوم نے اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ الحاد و دہریت کے پس پشت فلسفیانہ افکار کی بابت یہ مفید مطالعہ ہے۔

۱۶۔ مذہب اور جدید چیلنج

۱۷۔ مذہب اور سائنس

۱۸۔ سوشلزم اور اسلام

اپنی تمام تر فکری بے راہ روی کے باوجود مغرب کے مقابل دین کے مقدمے کو لے کر وحید الدین خان صاحب نے چند اچھے رسائل لکھے ہیں جن کا مطالعہ ابتدائی درجے کے طالب علموں کے لیے مفید ہو سکتا ہے لیکن ان کے دیگر افکار و نظریت سے دور رہا جائے تو بہتر ہے۔

۱۹۔ الحاد مغرب اور ہم

اپنے ابتدائی فکری دور میں ڈاکٹر غلام جیلانی برق مرحوم تجدد اور انکار حدیث کی وادیوں میں سرمارتے رہے۔ بعد ازاں توبہ کی اور اصول حدیث پر ایک کتاب لکھی، ابن تیمیہؒ کی سوانح لکھی اور الحاد و دہریت کے عنوان پر یہ بہت مفید کتاب تحریر فرمائی۔

۲۰۔ روسی الحاد (پس منظر و پیش منظر)

مولانا الطاف الرحمان بنوی صاحب کی یہ کتاب خاص اس عنوان پر انتہائی مفید شمار کی جاسکتی ہے۔

۲۱۔ نظریاتی جنگ کے اصول

۲۲۔ نظریاتی جنگ کے محاذ

مولانا اسماعیل ریحان صاحب دورِ جدید کے ایک معروف عالمِ دین اور مورخ ہیں ان کی یہ دو کتب خاص اس عنوان پر بہت مفید شمار کی جاسکتی ہیں۔

۲۳۔ وجود باری تعالیٰ۔فلسفہ، سائنس اور مذہب کی روشنی میں

ڈاکٹر حافظ محمد زبیر صاحب کی یہ کتاب خاص اس عنوان پر انتہائی مفید ہے۔

۲۴۔ اسلام اور سیکولرزم

سیاسی افکار کے دائرے میں علامہ یوسف القرضاوی مرحوم کی یہ کتاب بہت مفید ہے۔

۲۵۔ سیکولرزم

ڈاکٹر سفر الحوالی صاحب کی یہ کتاب مغرب میں الحادی فکر کی تاریخ اور اس کے سیاسی اثرات کو سمجھنے کے لیے انتہائی مفید شمار کی جاسکتی ہے۔

۲۶۔ الحاد (ایک تعارف)

یہ رسالہ محمد دین جوہر صاحب، ڈاکٹر مبشر نذیر صاحب اور حافظ محمد شارق صاحب کی مشترکہ کاوش ہے اور ابتدائی درجے کے طالب علموں کے لیے بہت مفید ہے۔

۲۷۔ اسلام، سائنس اور الحاد

سوشل میڈیا پر لکھے گئے محمد سلیم صاحب کے مضامین کا یہ مجموعہ ابتدائی طالب علموں کے لیے انتہائی مفید ہے۔

۲۸۔ تعارف تہذیب مغرب اور فلسفۂ جدید

مولانا مفتی محمد احمد کی یہ کتاب خاص اس موضوع پر ابتدائی درجے کے طالب علموں کے لیے مفید ہے۔

۲۹۔ اسلام اور جدیدیت کی کشمکش

ہمارے محترم دوست ظفر اقبال صاحب کی یہ کتاب اس عنوان پر انتہائی مفید ہے اور ابتدائی درجے سے اوپر کے طالب علموں کو اس کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔

۳۰۔ اسلام اور تزکیہ نفس مغربی نفسیات کے ساتھ تقابلی مطالعہ

۳۱۔ اسلام اور تہذیب مغرب کی کشمکش

۳۲۔ اسلام اور رد مغرب

خاص اس عنوان پر لکھی جانے والی موجودہ دور کی کتب میں ڈاکٹر محمد امین صاحب کی کتب میں سے یہ انتخاب اس موضوع کے طالب علموں کے لیے انتہائی مفید ہے۔

۳۳۔ خدائی سرگوشیاں

مجیب الحق حقی صاحب ایک معروف محقق ہیں اور ان کی یہ کتاب اپنے عنوان پر بہت مفید ہے۔

۳۴۔ الحادِ جدید کے مغربی اور مسلم معاشروں پر اثرات

دور جدید میں لکھی گئی کتب میں ڈاکٹر مبشر نذیر صاحب کی یہ کتاب انتہائی مفید شمار کی جاسکتی ہے۔

۳۵۔ وحدیت ادیان اور اسلام

دور جدید کے الحاد کی ایک شاخ وحدت ادیان بھی ہے۔ خاص اس عنوان پر سلطان احمد اصلاحی صاحب کی یہ کتاب بہت مفید ہے۔

یہ چند ایک کتب اور مختصر سا تعارف یہاں پر ہم نے پیش کیا ہے۔ کوشش یہ ہوگی کہ آئندہ مزید کتب کی فہرست شریک کی جائے۔

تفہیم دین

ڈاکٹر حسیب احمد خان

غامدی مکتبِ فکر: تجزیہ وتنقید کا صحیح منہج

غامدی صاحب ہوں یا اسلامی دنیا میں ماضی قریب خاص کر دور استعمار اور مابعد استعمار اٹھنے والی تحریکوں کی سرکردہ شخصیات جنہیں اسلامی دنیا کے ماڈرنسٹ کہا جاسکتا ہے، کا بنیادی مقدمہ تین اہم نکات پر کھڑا ہے۔ اگر ان نکات کو ترتیب وار دیکھا جائے تو ہمیں وہ "میزان" دکھائی دیتی ہے کہ جس پر یہ حضرات دین اور اس کے متعلقات کا تعین کرتے ہیں۔

پہلا نکتہ تو یہ کہ دین صرف ایک محدود تر تناظر میں اپنی روایت کے ساتھ قابل قبول ہوسکتا ہے یعنی دین کو اس کے تاریخی تسلسل اور روایت سے الگ کر کے صرف چند اصولی اور اخلاقی مباحث لے لیے جائیں اور باقی دین کی ایک ایسی تعبیرِ نو کی جائے جو موجودہ دور کے ساتھ چل سکے۔ درحقیقت دین کی پوری روایت کے حوالے سے اس طبقے کو یہ اعتماد نہیں ہے کہ معاشرتی اور تہذیبی سطح پر یہ اپنا وجود برقرار رکھنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

دوسرا نکتہ دین کو مخصوص دائروں میں یا دائرے میں محدود کرنے کا ہے۔ ان کے نزدیک دین ایک مکمل نظامِ حیات نہیں ہے بلکہ محدود اعتقادی و اخلاقی امور پر مشتمل ایک نظریہ ہے۔ باقی معاشی، معاشرتی، سیاسی، تہذیبی میدانوں میں دین کا سرمایہ داریت پسند ہوجانا یا لبرل ہو جانا یا سیکولر ہوجانا یا ہیومنسٹ ہوجانا ان کے نزدیک کوئی خاص مسئلہ نہیں ہے۔

تیسرا نکتہ دین کی خالص ریشنل تعبیر ہے، دین کی ایک ایسی تعبیر کہ جسے آج کی عقل تسلیم کر سکے۔ اسی لیے مابعدالطبیعیات یا ماوراء العقل مسائل کا اس طبقے میں انکار ملتا ہے۔

اگر ان نکات کو سامنے رکھ کر اس منہجِ فکر کا مطالعہ کیا جائے تو کسی ایک منطقی نتیجے تک پہنچا جا سکتا ہے۔ دورِ جدید میں تجدد کے حوالے سے غامدی منہج فکر کی سٹڈی فتوے کی زبان سے ہٹ کر خالص اکیڈمک مطالعے کی متقاضی ہے۔

اسلام اور پاکستان

ڈاکٹر رشید ارشد [۱]

'اسلامی جمہوریت' سے اسلام کیوں نہیں آسکتا؟

جدیدیت کا بنیادی مسئلہ ہر طرح کی ماورائیت (Transcendence) یا نیم ماورائیت (Semi-Transcendence) کا انکار ہے جو خدا اور دین کے سماجی، تاریخی اور قانونی انکار کو لازم کر دیتا ہے اور اپنے اس ہدف کو وہ جمہوریت کے ذریعے حاصل کرتی ہے۔ جدیدیت سیکولرازم کو ریاستی پالیسی اور معاشرتی قدر کے طور پر وجود میں لاتی ہے۔ اس میں چیزوں کو دیکھنے کا تناظر مادی اور تجربی ہے جو کہ انسان کے حواس کا فراہم کردہ ہے کیونکہ کسی شے کے ساتھ تعلق یا تو کسی مادی ضرورت کی وجہ سے یا نفس کے اقتضائے لذت اور جذبہ آزادی کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ جدیدیت ایسی علمی سرگرمیوں کو قبول کرتی ہے جو مقصودِ افادیت یا مطلوبِ لذت کو حاصل کرنے میں کام آئیں۔ افادیت جوئی اور لذت کوشی پر اصرار کی وجہ سے ان کا تصورِ علم ہی نہیں بلکہ پورا تصورِ انسان اور تصورِ دنیا مختلف ہو گیا اور ان بنیادی فطری تصورات کا اصل اور مقوم یعنی تصورِ خدا بلا جواز ہو گیا۔ دینی تصور میں افادیت کی بنیاد زیادہ تر اخروی ہے اور لذت پر ایسی قیدیں لگی ہوئی ہیں جو اس داعیے کو نفس اور اس کے فوری متعلقات کے درمیان ابھرنے ہی نہیں دیتی۔ دین افادیت اور لذت کو فطری مطالبات کی حیثیت سے اہمیت تو دیتا ہے لیکن اسے تعلق باللہ سے مشروط رکھتا ہے۔ یعنی افادیت اور لذت کو جبلی سطح سے بلند کر کے روحانی اور اخلاقی تسکین کے اسباب بناتا ہے۔ اسی لیے وہ ان داعیات کی تشفی کو اخلاقی وجود کی بیداری کے ساتھ آخرت پر مؤخر رکھتا ہے اور اس طرح انسان کو ذوقی اور تجربی سطح پر یہ باور کروا دیتا ہے کہ وہ محض فنا اور عدم کے گارے سے بنا ہوا وجود نہیں ہے بلکہ بقا کا ایسا عنصر رکھتا ہے جس میں اس کے حاصلات اور دنیا میں اس کی سرگرمیوں کے نتائج ہمیشگی کے ساتھ محفوظ رہتے ہیں۔ اس تفصیل کی روشنی میں اگر دیکھا جائے تو جدیدیت کے تمام مسلمات اور اقدار اس پوری الٰہی اسکیم سے بغاوت کے نتائج ہیں۔

---

[۱] شعبۂ فلسفہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

جدیدیت سے جزوی مناسبت بھی دین کے ساتھ ذہنی و اخلاقی تعلق کو بے اصل بنا سکتی ہے لیکن جدیدیت بھی خود اپنی جزوی قبولیت کو روا نہیں رکھتی، اسے یا تو پورا ماننا ہے یا پورا ردّ کرنا ہے۔ ہماری فی الوقت بڑی مشکل یہ ہے کہ ہم جدیدیت کو چند مظاہر تک محدود سمجھ کر اس کو قبول کرنے کا رجحان رکھتے ہیں یا اس کی بعض باتوں کو دین سے متصادم قرار دے کر ردّ کر دیتے ہیں اور بقیہ چیزوں میں دین سے کوئی براہ راست ٹکراؤ نہ دیکھنے کی وجہ سے انھیں اپنا لیتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ جدیدیت کو بعض اجزا میں رد کر دینے کے باوجود، اس کی بعض چیزوں کو قبول کرنے کے سبب سے اس کا 'کُل' قبول کرنے والے میں خود بخود منتقل ہو جاتا ہے۔ مثلا جیسا کہ تجربے سے ثابت ہے کہ جمہوریت کی اس خیال کے ساتھ اسلام کاری کی گئی کہ اس میں اقتدار اعلی ذات خداوندی کو حاصل ہوگا اور منتخب ارکان عوامی فلاح کے لیے اس کے تحت قانون سازی کے مجاز ہوں گے، لیکن نتیجہ یہ نکلا کہ جز کے ساتھ کُل خود بخود آ گیا اور وہ تبدیلیاں جو جمہوریت کے اصل اصول میں کی گئی تھیں وہ غیر فعال رہ گئیں اور شریعت و مذہب کی بجائے انسانی عقل کی بنیاد پر فیصلے اور قانون سازی ہونے لگی (جیسے سود، عائلی قوانین، ٹرانس جینڈر وغیرہ)۔ اس خطرے کو سمجھنا چاہیے کہ جدیدیت کا response محض فہم کی سطح پر کرنا ناکافی ہے، اس کے لیے ایسے راسخ دینی ذوق کی ضرورت ہے جو اس کے ماورائے ذہن اثرات پر بند باندھ سکے۔ ہماری صورتِ حال یہ ہے کہ ہم ذوقی سطح پر جدیدیت کو اپنے انتخاب کردہ اجزا کے ساتھ قبول کر چکے ہیں اور فہم کی سطح پر انہی اجزا سے لڑتے رہتے ہیں۔ اہلِ دین کو چاہیے کہ اس خطرے کو سمجھانے کے ساتھ ساتھ اس ذوقِ دین کی ترویج کا ایسا کام کریں کہ مسلمانوں کو جدیدیت سے ایک ذوقی بُعد اور عدم مناسبت حاصل ہو جائے، پھر چاہے بعض ذہنی و عملی مصلحتوں سے جدیدیت کی بعض روایتوں سے مثلاً ٹیکنالوجی وغیرہ سے پیدا ہونے والے بعض مظاہر کو استعمال کر بھی لیا جائے تو نقصان کم ہوگا۔ البتہ اس قبول میں بھی ذوقی تردید شامل رہنی چاہیے۔

اسلام اور پاکستان ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری

۲۰۲۴ء کے انتخابات اور دینی سیاسی جماعتوں کا لائحہ عمل

اگر ساری دینی سیاسی جماعتیں متحد ہو جائیں اور غیر سیاسی دینی قوتیں ان کا ساتھ دیں تو انتخابات میں بڑی کامیابی حاصل کی جاسکتی ہے

[ہم اپنی اس رائے کا اظہار کئی دفعہ کر چکے ہیں کہ پاکستان میں جمہوری انتخابات کے ذریعے اسلام غالب نہیں آسکتا اور نہ سیاسی وغیر سیاسی دینی قوتوں کے متحد ہونے کا کوئی امکان عملاً ہمیں نظر آتا ہے لیکن اس کے باوجود ہم رکن ادارت ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری صاحب کی رائے کا احترام کرتے ہوئے ان کا مضمون دے رہے ہیں ۔مدیر]

انتخابات ۲۰۲۴ء میں ملک کی دینی سیاسی جماعتوں کو شرکت کرنی چاہیے اور ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ غیر سیاسی دینی قوتیں، سیاسی دینیجماعتوں کی پشت پناہی کریں۔اس کی دو وجوہات ہیں:

بنیادی وجہ یہ ہے کہ پاکستان ایک سرمایہ دارانہ جمہوریت ہے اور سرمایہ دارانہ جمہوریتوں میں ہمیشہ ریاستی عمل معاشرتی عمل پر غالب رہتا ہے۔ ریاستی عمل کا دائرہ تحکمِ قانونِ سرمایہ مہیا کرتا ہے اور سرمایہ دارانہ قانونی تحکم سے پہلو تہی کرنا کسی کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔غیر سیاسی دینی جماعتیں اور افراد بھی تحکم قانونِ سرمایہ کے اتنے ہی مطیع ہیں جتنے دینی سیاسی گروہ۔ انتخابی عمل سے اغماض اس بنیادی نظاماتی حقیقت سے آنکھیں بند کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

دستوری جمہوریتوں میں انتخابی عمل کتنا ہی غیر شفاف اور کرپٹ کیوں نہ ہو تحکمِ قانونِ سرمایہ کو کسی نہ کسی حد تک مجروح کرنے کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ وہ عوام کو سرمایہ دارانہ اہداف اور ترجیحات کو چیلنج کرنے کا ایک موقع فراہم کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دستوری جمہوریتوں میں علما اور مشائخ کے سوادِ اعظم نے انتخابات میں شرکت کو ہمیشہ جائز قرار دیا اور ہم کئی ممالک میں (مثلاً الجزائر ۱۹۹۱ء، مصر ۲۰۱۲ء، ترکی ۲۰۲۳ء) انتخابات کو اسلامی اجتماعیت کے فروغ کا ایک ذریعہ بنانے میں کامیاب بھی رہے (اور حال ہی میں ملائشیا میں

بھی کامیابی ملی ہے)۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ رائے دہندگان کی اکثریت عموماً انتخابی عمل سے لاتعلق رہتی ہے۔ عوامی رائے کے تخمینے یہ بتاتے ہیں کہ ۲۰۲۴ء میں پانچ کروڑ سے زیادہ افراد ووٹ ڈالیں گے۔ ۲۰۱۸ء کے انتخابات میں اسلامی جماعتوں کو تقریباً ۵۵ لاکھ ووٹ ملے تھے (یعنی رائے دہندگان کا تقریباً دس فیصد)۔ انتخابی عمل سے اجتناب کا مطلب رائے دہندگان کی دس فیصد کو سیکولر جماعتوں کی تائید پر مجبور کرنا ہے کیونکہ انتخابی بائیکاٹ کی مہم دستوری جمہوریتوں میں عموماً ناکام ثابت ہوتی ہے۔

لہٰذا انتخابی عمل میں شرکت اسلامی جماعتوں (سیاسی اور غیر سیاسی) دونوں کے لیے ضروری ہے۔ جب تک ریاست دعوتی عمل کو برداشت کرنے پر یا اس کی پشت پناہی پر تیار نہ ہو مخلصین دین کی عملی قوتِ نافذہ دعوتی کام کے پھیلاؤ کے باوجود لازماً محدود رہتی ہے۔ انتخابی عمل میں شرکت مخلصین دین کی قوت نافذہ کو فروغ دینے کے لیے دستوری جمہوریتوں میں ناگزیر ہے۔

۲۰۲۴ء کا انتخابی عمل

۲۰۲۴ء کے انتخابات لازماً کرپٹ ہوں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ دستوری جمہوریتوں میں انتخابی عمل عموماً کرپٹ ہی ہوتا ہے۔ یہ بات امریکا اور برازیل کے ۲۰۲۲ء کے انتخابات سے ثابت ہوتی ہے۔ دونوں ملکوں میں کئی کروڑ عوام انتخابی عمل کو کرپٹ تسلیم کرنے پر اصرار کرتے ہیں۔ ترکی کے ۲۰۲۳ء کے انتخابات بھی کرپٹ تھے جہاں اردگان کے اصل حریف کو سال بھر پہلے عدلیہ سے گرفتار کروا دیا گیا تھا۔

انتخابات کے لازماً کرپٹ ہونے کا سبب سرمایہ داری کی نظامتی ضرورت ہے تا کہ اس کے غیر منتخب حاملینِ اقتدار عوامی منتخب نمائندوں پر حاوی رہیں۔ غیر منتخب نمائندہ ادارے نوکر شاہی، میڈیا، عدلیہ، کارپوریشنیں اور فوج سرمایہ دارانہ تعقل (ریشنیلٹی) کی بنیاد پر پالیسیاں وضع اور نافذ کرتی ہیں۔

چونکہ یہ ریشنلیٹی غیر معقول ہے لہٰذا اس کا عمل ہمیشہ تضاداتی رہتا ہے اور ان تضادات

کے اظہار کا امکان منتخب نمائندگان کے عمل سے ہمیشہ محدود ہوتا رہتا ہے۔لہٰذا غیر منتخب ریشنل اداروں کے لیے ضروری ہے کہ وہ منتخب نمائندوں کو اپنے ریشنل پالیسی اقدامات پر مجبور کرتے رہیں۔سرمایہ دارانہ جمہوریتوں میں منتخب نمائندگان کا اقتدار مصنوعی اور غیر منتخب اداروں کا اقتدار اصلی ہوتا ہے اور نظاماتی تحکم کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ ایسے نمائندے منتخب ہوں جو غیر منتخب مقتدرین کے فیصلوں کو چیلنج نہ کریں۔انتخابی عمل سے وہی نتائج برآمد ہوتے رہیں جو غیر منتخب مقتدرہ کے ریشنل فیصلوں کی تائید کرتے ہیں۔لہٰذا انتخابی عمل کو غیر کرپٹ نہیں ہونے دیا جاسکتا۔یہ سرمایہ دارانہ عقلیت (ریشنلیٹی) کا تقاضا ہے۔

ہاں جن ممالک کے عوام کی اکثریت ریشنل اصولوں کے مطابق ریاستی پالیسی سازی کو جائز سمجھتی ہے، تحکمِ قانونِ سرمایہ پر مطمئن ہے اور سرمایہ دارانہ طرزِ حیات اختیار کیے ہوئے ہے مثلاً مغربی یورپ کے ممالک کے باشندے، وہاں انتخابی عمل حقیقتاً مسابقتی اور شفاف ہو سکتا ہے۔کیونکہ ان ممالک میں تحکمِ قانونِ سرمایہ سے عوامی بغاوت کے امکانات معدوم ہیں۔

پاکستان میں انتخابی عمل غیر کرپٹ نہیں ہوسکتا کیونکہ ہمارے عوام ریشنل نہیں اور انتخابی عمل اس عوامی غیر ریشنلیٹی کے اظہار کا ایک ممکنہ ذریعہ ثابت ہوسکتا ہے۔لہٰذا سرمایہ دارانہ غیر نمائندہ ادارے (عدلیہ، انتطامیہ، کارپوریشنیں، میڈیا، فوج) اپنی اقتداری برتری کو قائم رکھنے پر مجبور ہیں اور اسی اقتداری بالادستی کو قائم رکھنے کے لیے انتخابی عمل کو منتظم (مینج) کرتی رہتی ہیں۔

۱۹۷۰ء سے لے کر ۲۰۱۸ء تک جتنے انتخابات ہوئے ان سب کو منتظم (مینج) کرنے میں غیر نمائندہ سرمایہ دارانہ مقتدر ادارے کامیاب رہے۔ ۲۰۲۴ء کے انتخابات کو بھی ایسے ہی منتظم (مینج) کیا جائے گا اور مینجمنٹ کے اس عمل کو سب سیاسی جماعتیں قبول یا برداشت کریں گی۔ریاستی اقتدار پر سرمایہ دارانہ اشرافیہ (منتخب اور غیر منتخب) کا قبضہ قائم رہے گا لیکن اس اقتداری گرفت کو کمزور کرنے کے مواقع ۲۰۲۴ء کا انتخابی عمل ضرور فراہم کرتا ہے۔

تحکمِ قانونِ سرمایہ کو معطل کرنا تحفظِ دین اور غلبۂ دین کی تحریکوں کے لیے ضروری ہے کیونکہ جب تک ریاستی فیصلے سرمایہ دارانہ عقلیت (ریشنلٹی) کی بنیاد پر کئے جاتے رہیں گے

اس وقت تک مخلصینِ دین کی معاشرتی قوت نافذہ لازماً محدود رہے گی۔ ۲۰۲۴ء کے انتخابی عمل کے ذریعے سیکولر قوتوں کو ریاستی اقتدار سے بالکلیہ بے دخل نہیں کیا جا سکتا لیکن ان کی اقتداری گرفت کو کمزور ضرور کیا جا سکتا ہے اور مخلصینِ دین کی ریاستی حکمی قوتِ نافذہ میں اضافہ کرنا بھی ممکن ہے۔

ممکنہ خطرہ

۲۰۲۴ء کے انتخابی عمل کی مینجمنٹ کے نتیجہ میں لازماً کوئی سیکولر جماعت یا سیکولر جماعتوں کا کوئی اتحاد اگلی حکومت قائم کرے گا۔ تمام سیکولر جماعتیں سامراج کی باجگزار ہیں۔ وہ سب عالمی تحکم سرمایہ کو پاکستان کی معیشت اور معاشرت پر مسلط کرنے کی خواہاں ہیں۔ کوئی بھی سیکولر جماعت (یا سیکولر جماعتوں کا اتحاد) حکومت بنانے میں کامیاب ہوا وہ آئی ایم ایف سے اگلا تین سالہ ای ایف ایف معاہدہ ضرور کرے گا اور امریکہ اور چین کی علاقائی تزویراتی بالادستی کی ماتحتی ضرور قبول کرے گا۔ سامراجی تابعداری کو قبول کرنے کے ضمن میں سیکولر جماعتوں میں کوئی فرق نہیں۔

لیکن اسلامی تحریکوں کے ضمن میں ان کے رویے میں اختلاف ہے۔ کچھ سیکولر جماعتیں اسلام دشمن ہیں مثلاً پیپلز پارٹی، متحدہ قومی موومنٹ، پختونخواہ ملی عوامی پارٹی، اے این پی، بلوچستان کی قوم پرست جماعتیں وغیرہ۔ یہ مخلصینِ دین کو اپنا دشمن گردانتی ہیں اور پاکستانی معاشرت کو سیکولرائز کرنے کے عملی اقدام کرتی رہتی ہیں۔ اگر ان جماعتوں نے حکومت بنائی تو یہ لازماً مخلصین دین کے معاشرتی نفوذ کو محدود کرنے کی بھرپور کوشش کریں گی۔

اس کے برعکس ملک کی دو بڑی سیکولر جماعتیں مسلم لیگ اور تحریک انصاف اسلام دشمن نہیں۔ ان کی نظریاتی اساس مسلم قوم پرستی ہے اور یہ مخلصین دین کو اپنا ہم نوا بنا کر نظامِ اسلامی کی سرمایہ کاری کی کوشش کرتی ہیں۔ اگر ہم نے ۲۰۲۴ء کے انتخابی عمل میں موثر حصہ نہ لیا تو مخلصین دین کا سوادِ اعظم انہی "اسلام پسند" سیکولر جماعتوں کو ووٹ دے گا۔

۲۰۲۴ء کی انتخابی مہم کے اسلامی اہداف

ہم اسلامی انقلابی ہیں۔ آئیڈیالسٹ (مثالیت پسند) نہیں ہیں۔ ہم جس انتخابی حکمت

عملی کو مرتب کرنے کی کوشش کریں گے وہ حقیقت پسندانہ ہوگی یعنی ایسے اہداف متعین کریں جو پاکستان کی موجودہ سیاسی اور معاشرتی سطح پر قابلِ حصول ہوں۔ ان اہداف کا حصول تحکمِ اسلامی کے قیام اور سرمایہ دارانہ نظاماتی انہدام کی طویل المدت جدوجہد کا ایک مرحلہ ہوگا۔ اسلامی حکومت کا فی الفور قیام نہ پاکستان میں ممکن ہے نہ اسلامی انتخابی جدوجہد کا حالیہ حقیقت پسندانہ ہدف ہوسکتا ہے۔ ۲۰۲۴ء کی اسلامی انتخابی مہم کے قابل حصول اہداف حسب ذیل تجویز کئے جاتے ہیں:

۱۔ انتخابی عمل میں شمولیت اور کامیابی کے ذریعے مخلصینِ دین کی معاشرتی قوتِ نافذہ میں اضافہ۔

۲۔ انتخابات کے نتیجہ میں جو حکومت بنے اس کو مخلصین دین کی معاشرتی قوتِ نافذہ میں اضافہ کو برداشت کرنے پر راضی اور مجبور کرنا۔

۳۔ نئی منتخب حکومت پر دباؤ ڈالنا کہ وہ سامراج کی معاشی اور عسکری تابعداری سے گریز کرے۔

۴۔ سیکولر جماعتوں (بالخصوص پیپلز پارٹی، اے این پی اور ایم کیو ایم) کو انتخابی عمل میں شکست دینا اور اسلام پسند سیکولر جماعتوں کو اسلام دشمن سیکولر جماعتوں کے ساتھ مل کر ایک مخلوط حکومت بنانے سے باز رکھنے کی کوشش کرنا

۵۔ انتخابات میں ۳۰ سے ۳۵ اسلامی نمائندوں کا منتخب ہونا (جن میں اکثریت علما اور مشائخ کی ہو) جو نئی بننے والی اسمبلی میں ویسا ہی کردار ادا کریں جیسا مولانا نورانی کی قیادت میں حزب اختلاف کے طور پر ۱۹۷۲ء تا ۱۹۷۷ء کی اسمبلی میں ادا کیا تھا۔

۶۔ مخلصینِ دین کو اسلام پسند سیکولر جماعتوں (مسلم لیگ اور تحریک انصاف) کی حمایت سے دست بردار ہو کر اسلامی جماعتوں کی اعانت اور تعاون پر راضی کرنا

اسلامی انتخابی حکمت عملی

یہ تمام اہداف قابل حصول ہیں لیکن اس کا انحصار ایک موثر حکمت عملی اپنانے کا متقاضی ہے۔ اس حکمتِ عملی کے اجزا حسب ذیل ہیں:

۱۔سب سے اہم اور بنیادی ضرورت اتحادِ اسلامی کی ہے۔ ۲۰۱۸ء کے انتخابات میں ہمیں ۵۳ لاکھ کے قریب ووٹ ملے تھے لیکن وہ بارہ اسلامی جماعتوں میں تقسیم ہو گئے تھے اور ہماری پارلیمانی نمائندگی نہایت محدود رہی۔ ہمیں جو ووٹ ملے تھے ان میں ۸۰ فیصد سے کچھ زیادہ تحریک لبیک اور جمعیت علمائے اسلام کے حصہ میں آئے تھے۔ ۲۰۲۴ء کے انتخابات میں ان دو جماعتوں کا اتحاد ناگزیر ہے۔اس سے ہمارا ووٹ بینک قوی ہو جائے گا اور دیگر اسلامی جماعتیں بھی اس میں شریک ہو جائیں گی۔اگر یہ اتحاد قائم نہ ہوا تو اسلامی جماعتیں سیکولر جماعتوں سے اشتراک عمل پر اور غیر منتخب مقتدرہ کا سہارا لینے پر مجبور ہو جائیں گی۔اگر یہ اتحاد قائم ہو گیا اور اس نے موثر فعالیت کا اظہار کیا تو اسلامی اتحاد کو ایک کروڑ سے زیادہ ووٹ مل سکتے ہیں اور ہمارے ۳۰ سے لے کر ۳۵ تک نمائندگان منتخب ہونے کا امکان ہے۔

۲۔ انتخابی مہم جتنی جلدی شروع کی جائے اتنی زیادہ موثر ہو گی بشرطیکہ مشترکہ مہم ہو۔ انفرادی اسلامی جماعتوں کی مہم نہ ہو۔ اس مہم کا ایک اہم مقصد غیر سیاسی دینی جماعتوں اور حلقوں کو انتخابی مہم میں دینی سیاسی جماعتوں کا ہمنوا بنانا ہو۔مواصلاتی ذرائع اور انفرادی روابط کے ذریعے غیر سیاسی دینی حلقوں کو باور کرانے کی کوشش کرنی چاہیے کہ انتخابی عمل سے لاتعلقی کا مطلب سیکولر قوتوں کے نظاماتی تسلط کو قبول کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں اور اسلامی سیاسی اتحاد تحفظِ دین اور غلبۂ دین کے لیے ہی انتخابی عمل کو استعمال کر رہا ہے۔

۳۔ یہ اس وقت ممکن ہے جب اسلامی اتحاد اپنا مذہبی تشخص واضح کرے۔ انتخابی منشور خالصتاً اسلامی ہو۔قوم پرست، سوشل ڈیموکریٹ اور لبرل دعووں اور وعدوں سے بھرا ہوا نہ ہو۔سیکولر جماعتوں کے منشوروں سے بالکل مختلف ہو۔ ہماری انتخابی مہم کی شناخت خالصتاً مذہبی ہو۔ ہمارے منشور عوام کی مذہبی جذباتیت کا ذریعہ ہو۔ یہ انتخابات ''تحفظ ناموس رسالت''، تحفظِ ختمِ نبوت اور ردِ قادیانیت کی مہمات کے تسلسل کے طور پر لڑیں۔سویڈن اور ڈنمارک کے سفیروں کو ملک بدر کر کے ان ممالک سے تمام تعلقات منقطع کرنا ہمارا بنیادی مطالبہ ہو۔

۴۔ ہماری انتخابی مہم مسجد، محلہ اور بازار کی بنیادی سطح پر منظم ہو۔ انتخابی اتحاد بالائی سطح تک محدود نہ ہو جیسا کہ ایم ایم اے کا اتحاد تھا بلکہ عوامی سطح پر مخلصینِ دین کے بین المسلکی اتحاد

قائم کرنے کی کوشش کی جائے اور کوشش کی جائے کہ مساجد کی سطح پر قائم کیے گئے اس محلہ جاتی تنظیمی ڈھانچے کو ائمہ مساجد کی قیادت میں لوکل گورنمنٹ کے فرائض منصبی ادا کرنے کا متحمل بنایا جاسکے۔ اسلامی پارلیمانی نمائندوں کی یہ ذمہ داری ہوگی کہ وہ اس محلہ جاتی تنظیم کے دائرہ اختیار میں توسیع کے لیے پارلیمانی جدوجہد کے ذریعے "اسلام پسند" سیکولر جماعتوں کو اس قسم کی توسیع کو برداشت کرنے پر راضی یا مجبور کرتے رہیں۔

۵۔ اسلامی اتحاد صرف ان حلقوں میں امیدوار نامزد کرے جہاں فتح کے امکانات واضح ہوں۔ ہم الیکٹیبلز کو اپنا نمائندے نہ بنائیں اور سیکولر جماعتوں (اسلام دشمن اور اسلام پسند دونوں) سے سیٹ ایڈجسٹمنٹ سے بھی پرہیز کریں۔ ہم عموماً علمائے دین کو اپنے نمائندگان کے طور پر نامزد کرنے کی کوشش کریں۔

اختتامیہ

اس حکمت عملی کے اپنانے کا مقصد حکومتِ اسلامی کا قیام نہیں بلکہ ان اہداف کا حصول ہے جو پہلے بیان کئے جاچکے ہیں بالخصوص مخلصینِ دین کو معاشرتی سطح پر منظم کرنا اور حکومت وقت کو اس انتظام سازی کو برداشت کرنے پر راضی اور مجبور کرنا۔ یوں اسلامی شعائر کے فروغ اور تحفظِ دین کے کام کو آگے بڑھانے کی سازگار فضا پیدا کی جاسکے گی اور حکومتِ وقت کو اس توسیعِ دعوت کو طوعاً و کرہاً قبول کرنے پر آمادہ کیا جاسکے گا۔

اس حکمتِ عملی کو اپنانے سے اس بات کا امکان بھی ہے کہ حکومتِ وقت کی سامراجی تابعداری کو محدود کیا جاسکے گا اور پارلیمان اور ملک میں ایک مضبوط اسلامی گروہ سامراج نواز اقدامات کی پیہم مخالفت منظم کرتا رہے گا۔ اس کا کچھ نہ کچھ اثر ریاستی پالیسی سازی پر ضرور پڑے گا۔

اگر اتحادِ اسلامی قائم اور فعال ہوگیا (بالخصوص جمعیت علمائے اسلام اور تحریک لبیک کا اتحاد) تو اس کا امکان موجود ہے کہ قومی اسمبلی میں ایک مضبوط اسلامی بلاک قائم ہوجائے۔ یہ بلاک آئندہ پانچ سال تک پارلیمان میں حزب اختلاف کا ویسا ہی کردار ادا کرے جیسا مولانا نورانی، مفتی محمود اور پروفیسر عبدالغفور کی قیادت میں اسلامی قوتوں نے بھٹو کے دور (۱۹۷۲ء تا ۱۹۷۷ء) میں ادا کیا تھا۔ اس بلاک کا اولین مقصد پارلیمان میں مخلصینِ دین کی معاشرتی ادارتی

صف بندی کی مہم کا تحفظ اور فروغ ہو تا کہ ہم ۲۰۲۹ء کے انتخابات تک تحریکِ نظامِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دوبارہ برپا کرنے کی پوزیشن میں آ جائیں۔

۲۰۲۴ء کے انتخابات یہ موقع فراہم کرتے ہیں کہ اسلامی قوتوں کی معاشرتی جڑیں مستحکم کرنے کی مہمات کو فروغ دیا جائے۔ ہماری بنیادی معاشرتی کمزوری یہ ہے کہ مخلصینِ دین (جو ایک محتاط شماریاتی تخمینہ کے مطابق ۲۰۲۲ء میں ملک کی آبادی کا تقریباً نو فیصد یعنی دو کروڑ تھے) قوتِ نافذہ سے محروم ہیں۔ ان کی مذہبی عصبیت کا اظہار ان کی ذاتی زندگیوں تک محدود رہتا ہے اور وہ تحکم قانونِ سرمایہ کی ماتحتی پر مجبور رہتے ہیں۔ تحفظِ دین کی تحریکوں اور غلبۂ دین کی تحریکوں کی یہ مشترکہ ذمہ داری ہے کہ وہ مخلصینِ دین کی اقتداری ادارتی تنظیم سازی کا بیڑا اٹھائیں اور انتخابی مہم کو اس کا ذریعہ بنائیں۔

انتخابی عمل تو ۲۰۲۴ء کی فروری میں ختم ہو جائے گا لیکن انتخابی مہم کے دور میں جو معاشرتی ادارتی صف بندی قائم کی جائے گئی اس کو دوام بخشنا اسلامی سیاسی اور معاشرتی جدوجہد کو جاری رکھنے کے لیے ناگزیر ہے۔ اسی طریقے سے جمہوری عمل کو تحفظِ دین اور غلبۂ دین یا اسلامی انقلاب کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس طریقے سے جمہوری عمل کو تحکم قانونِ سرمایہ کی تحدید اور تنسیخ کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے (ایران میں یہی کیا جا رہا ہے) پاکستان میں انقلابی انتخابی طریقہ کے موثر استعمال کے مواقع موجود ہیں۔ پاکستانی ریاست کمزور ہے، اس کا معاشرتی تسلط غیر مستحکم ہے۔ چین اور امریکا کی رسہ کشی کے نتیجہ میں ملک پر سامراجی گرفت بھی ڈھیلی کرنے کے مواقع موجود ہیں۔ اسلام دشمن سیاسی قوتیں (پیپلز پارٹی، ایم کیو ایم، اے این پی وغیرہ) مطلب پرست اور سیاست کے علاوہ ہر جگہ غیر موثر ہیں۔ ۲۰۲۴ء کے انتخابات کے ذریعہ سامراج جو حکومت قائم کرے گا وہ کمزور ہوگی جو قدرے آسانی سے دباؤ میں لائی جا سکتی ہے۔ اسلامی بنیادی انتخابی حلقہ نسبتاً بڑا ہے اور دو کروڑ سے زیادہ افراد پر مشتمل ہے۔ انتخابی مہم سے اس بنیادی حلقے کو منظم اور معاشرتی طور پر بااقتدار بنایا جا سکتا ہے۔ کیا اسلامی جماعتیں (سیاسی اور غیر سیاسی دونوں) یہ کام کر سکیں گی۔

ہر ایک منتظر تیری یلغار کا

اسلام اور مغرب خالد بیگ

امریکہ میں اسلام اور مسلمانوں کا مستقبل[1]

مسلمانوں کی بڑی تعداد امریکی معاشرے میں ضم ہو کر اپنا دین، ایمان اور اقدار کھو رہی ہے

مَیں آپ تمام حضرات کا بہت شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے عزت بخشی، موقع دیا کہ مَیں آپ سے کچھ باتیں کرسکوں اور آپ اپنا قیمتی وقت نکال کر یہاں تشریف لائے۔ میرا موضوع ہے''امریکہ میں مسلمانوں کا ماضی حال اور مستقبل''۔ مقصود یہ ہے کہ امریکہ میں مسلمان اب تک کیا کرتے رہے ہیں، اس وقت ان کی کیا صورتِ حال ہے اور آئندہ کے بارے میں کیا توقعات اور خدشات ہیں، اس حوالے سے معروضات پیش کی جائیں اور کچھ حقائق کا تذکرہ کیا جاسکے جس میں یہاں کے ان لوگوں کے لیے بھی کچھ رہنمائی ہوگی جو وہاں جانے کے لیے بے تاب ہیں اور اُن کے لیے بھی رہنمائی ہوگی جو یہاں رہ کے وہاں کے مسلمانوں کی فکر کرتے ہیں، اور ان کے لیے کوئی مفید کام کرنا چاہتے ہیں، ان کی مدد کرنا چاہتے ہیں۔

کچھ عرصہ پہلے کی بات ہے کہ مولانا یوسف اصلاحی مرحوم[2] نے یہ واقعہ بیان کیا کہ وہ امریکہ اکثر آیا کرتے تھے۔ ان کی تقریر کے بعد کسی سائل نے ان سے پوچھا کہ مولانا آپ بتائیں کہ ہم یہاں رہیں یا پاکستان واپس چلے جائیں؟ مولانا نے کہا کہ آپ یہیں رہیں اور دین کا کام کریں۔ سائل نے کہا لیکن آٹھ سال پہلے میاں طفیل محمد یہاں آئے تھے اور انہوں نے کہا تھا کہ آپ واپس چلے جائیں۔ انہوں نے کہا کہ پھر آپ یہاں کیوں موجود ہیں؟ اگر آٹھ سال پہلے میاں طفیل محمد نے آپ سے کہا تھا کہ آپ چلے جائیں تو آپ ابھی تک یہاں کیوں موجود ہیں؟ مَیں عرض کروں گا کہ مولانا یوسف اصلاحی صاحب سے جو سوال کیا گیا اس کا سوالوں کی اُس قبیل سے تعلق ہے جسے انگریزی میں Rheotoric Questioon کہتے ہیں جسے

---

[1] خالد بیگ صاحب (امریکہ میں مقیم پاکستانی اسلامی سکالر) کی فاران کلب کراچی میں گفتگو جسے ڈاکٹر تسنیم احمد صاحب نے تحریری شکل میں منتقل کیا ہے۔ بشکریہ ماہنامہ نشور کراچی۔

[2] جماعت اسلامی ہند کے سابق امیر

اردو میں خطیبانہ سوال کہا جا سکتا ہے۔ایسا سوال جس کا مقصد کچھ دریافت کرنا نہیں ہوتا بلکہ کچھ بتانا ہوتا ہے۔اس واقعے کے اندر تین رویئے ہیں:

* ایک یہ کہ امریکہ کے اندر ہی مسلمان رہیں۔
* دوسرا یہ کہ امریکہ میں ہرگز نہ رہیں، واپس چلے جائیں۔
* تیسرا یہ کہ تذبذب کا عالم ہے کہ رہیں یا نہ رہیں۔

یہ تینوں رویے جو ہیں بہت حقیقی اہمیت والے اور بہت مضبوط معاشرتی اور اُخروی بنیادوں پر ہیں۔مَیں اس کی وضاحت کروں گا لیکن یہ وضاحت فوری نہیں یہ خود بخود ان شاء اللہ گفتگو میں آگے آجائے گی۔

(جناب خالد بیگ صاحب نے آغاز میں امریکہ کی تاریخ اور اُس کی دریافت اور وہاں مسلمانوں کی آمد پر قدرے تفصیل سے روشنی ڈالی جسے ہم یہاں صفحات کی تنگی کی وجہ سے چھوڑ رہے ہیں۔انہوں نے جو بہت اہم بات بتائی وہ یہ کہ) ساری دنیا یہ کہتی ہے اور اسکولوں میں یہ پڑھایا جاتا ہے کہ کولمبس نے امریکہ دریافت کیا یا یہ کہ وہ پہلا انسان تھا جو وہاں پہنچا۔ یہ بات معلوم حقائق کے خلاف ہے۔ وہاں لاکھوں کی تعداد میں انسان پہلے سے موجود تھے۔ ریڈ انڈینز کا تذکرہ تو سب سنتے ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ کولمبس پہلا یورپی باشندہ نہیں تھا جو وہاں پہنچا۔تاریخی شواہد کے مطابق بہت پہلے مسلمان نہ صرف وہاں پہنچے تھے بلکہ مسلمان ہی وہ لوگ تھے جو وہاں پہنچنے والے اولین انسان تھے۔کولمبس کے آنے کے بعد یورپیوں نے اسے آباد کرنا اور اس پر قبضہ کرنا شروع کیا تو مزدوری کے لیے افریقہ سے آزاد انسانوں کو زندہ شکار کر کے غلام بنا کر لانے کا سلسلہ شروع کیا۔

ان لائے جانے والے کم و بیش پچاس لاکھ غلاموں میں ۱۵ سے ۲۰ فیصد مسلمان تھے۔ ان کو انتہائی برے حالات میں رکھا گیا تھا اور جبری طور پر ان کا مذہب ان سے چھین لیا گیا۔ اس کے بعد جب غلامی کا سلسلہ ختم ہوا تو آزاد مسلمانوں کے آنے کا سلسلہ بھی شروع ہوا۔ ۱۸۲۰ء میں مراکش سے کچھ لوگ آئے۔ ۱۸۲۱ء میں لوگ ترکی سے آئے تھے جن کے حوالے کتابوں میں ملتے ہیں۔اس کے بعد ترکِ وطن اور مستقل سکونت کی اجازت (امیگریشن) لے

کر یہاں آنے والوں کی لہریں چلتی رہی ہیں۔امریکہ ایک ایسا ملک ہے جو درآمدی ہیومن پاور پر ہی چلتا رہا ہے لیکن اسے انہوں نے بہت احتیاط سے بیلنس کیا ہے کہ کبھی یہاں سے لوگوں کو بلا لیا، کبھی وہاں سے بلا لیا۔کبھی اِن کو روک دیا کبھی اُن کو روک دیا تا کہ بیلنس رہے اور کوئی ایک گروپ بھی حاوی نہ ہو سکے اور حاوی وہی رہیں جو گورے لوگ ہیں۔اس طرح سے مختلف لہروں کے اندر جو لوگ آئے ان میں تیسری لہر وہ تھی جو ۱۹۱۴ء کے بعد آئی۔اس کے اندر وہ لوگ بھی تھے جو ان علاقوں سے آئے جو بعد میں پاکستانی پنجاب کا حصہ بنے۔

ان تمام مختلف لہروں میں جو لوگ آئے ہیں ان سب کا کیا حشر ہوا؟ یہ ایک اہم سوال ہے اور جواب یہ ہے کہ ان کے نام ونشان مٹ گئے۔ان کی اولادیں مسلمان نہیں ہیں۔ان کے کوئی اثار بھی باقی نہیں ہیں۔ یہ سارے کے سارے ضم ہو گئے امریکہ کی سوسائٹی میں۔ چالیس سال پہلے مَیں نے شمالی کیلی فورنیا کا دورہ کیا جہاں پاکستانی پنجاب سے بہت لوگ آئے تھے اور میرا یہ شوق تھا کہ مَیں جا کر دیکھوں کہ اب ان کا کیا حال ہے۔ میں اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ گھومتا رہا اور ہمیں پورے شہر میں اتفاق سے کوئی مسلمان یا مسلمانوں کا نشان نہیں ملا۔ دن کے آخر میں ہمیں ایک جگہ ایک ریسٹورانٹ نظر آیا جس کے بورڈ پر لکھا تھا''غلام رسول ریسٹورانٹ'' اس غلام رسول ریسٹورانٹ میں ہم گئے تو ہم نے دیکھا کہ وہاں ایک میکسیکن آدمی کھڑا ہوا تھا اور اس نے ہمیں بتایا کہ اس کا نام غلام رسول ہے اور وہ اس کا مالک ہے۔ جب اس سے مزید بات چیت کی تو اس نے کہا کہ اس کا باپ مسلمان تھا، مگر وہ مسلمان نہیں ہے(مگر نام غلام رسول ہے)۔اس کے چھ بھائی تھے۔ چھ بھائی سب کے سب مختلف مذہبوں پر تھے،ان میں سے مسلمان کوئی ایک بھی نہیں تھا۔اس کے باپ سے صرف اس نے یہ چیز یاد رکھی تھی اور باپ کا اثر قبول کیا تھا کہ وہ اپنے ریسٹورانٹ کے اندر سؤر نہیں بیچتا تھا۔ باقی اس کے علاوہ اسلام کی کوئی اور چیز وہاں بھی باقی نہیں تھی۔

یہ تیسری لہر کا ذکر ہے اس کے بعد جو اس وقت تازہ لہر چل رہی ہے یہ وہ ہے جو ۱۹۶۵ء کے بعد سے آئی ہے۔اس میں بلحاظِ کیفیت (Qualitatively) فرق ہے۔ پہلے آنے والے لوگوں کے مقابلے میں، کیونکہ پہلے آنے والے لوگ زیادہ تر غریب اور محنت کش لوگ تھے، کسان اور مزدور وغیرہ تھے۔اب آنے والے لوگ زیادہ پڑھے لکھے تھے۔ان کو

اپنی تعلیم کی بنیاد پر ہی وہاں امیگریشن ملی۔اس لیے اس وقت مسلمانوں کی بڑی تعداد ایسی ہے جو معاشی طور پر کافی بہتر ہیں۔ان کے پاس پیسے زیادہ ہیں اوراس کے اثرات بھی آپ کو نظر آتے ہیں۔اس وقت آپ دیکھیں کہ امریکہ میں بڑی تعداد میں بہت عالی شان مساجد ہیں۔ کئی ملین ڈالر سے بنی مساجد کی زبردست عمارتیں ہیں۔اس بات کا پہلے کوئی تصور وہاں نہیں تھا۔ مسلمانوں کے دوسرے ادارے بھی ہیں۔ حلال گوشت کی دکانیں ہیں۔ ان کے ریسٹورانٹس ہیں۔اسی طرح ان کے ادارے ہیں جوان کے سیاسی حقوق کے تحفظ کے لیے ہیں اور بظاہر لگتا ہے کہ امریکہ کے اندر اسلام بہت تیزی سے پھیلنے والا مذہب ہے۔

المیہ یہ ہے کہ پہلے آنے والے سب مسلمان مٹ گئے تھے تو سوال یہ ہوتا ہے کہ کیا یہ مسلمان باقی رہیں گے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب دینا آسان نہیں ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر آپ غور سے دیکھیں تو وہاں پر بہت کچھ چیزیں اگر مثبت ہیں تو بہت زیادہ چیزیں منفی ہیں اوراس کا آخری نتیجہ کیا ہوگا؟ یہ بتانا بہت مشکل ہے۔مسجدیں ہیں،سکول ہیں،حلال گوشت کی دکانیں ہیں۔کانگریس وغیرہ میں بھی مسلمانوں کی بظاہر نمائندگی ہے لیکن دوسری طرح کی۔اصل مسئلہ یہ ہے کہ امریکی معاشرے کی دنیا پرستی،جنسی مادر پدر آزادی،بے حیائی اور فکری آوارگی کی اقدار کا جو شدید دباؤ ہے،مسلمان اور وہاں آنے والے تمام لوگ اس دباؤ کے تحت ہوتے ہیں۔یہ دباؤ ہر سطح پر ہے عقائد کی سطح پر،آپ کی اقدار کی سطح پر،اخلاق کی سطح پر الغرض ہر سطح پر ہے اور یہ قومی اور وطنی علائق سے بالا تمام دنیا سے آنے والے تمام مسلمانوں پر بری طرح سے اثر انداز ہو رہا ہے۔

مسلمان نوجوان نسل کا کیا حال ہے؟ عام مسلمانوں کا دین داری کے باوجود کیا رویہ ہے؟ یہ چیزیں اگر آپ غور سے دیکھیں تو اس میں بہت سی چیزیں آپ کو پریشانی کی نظر آئیں گی۔ ۲۰ سال پہلے یہ معاملہ تھا کہ تراویح پڑھانے کے لیے امریکہ میں مقامی حافظِ قرآن مسلمان نہیں ملا کرتے تھے۔انہیں پاکستان،انڈیا،مصر،ساؤتھ افریقہ اور برطانیہ سے تراویح پڑھوانے کے لیے درآمد کیا جاتا تھا۔اب ایسا نہیں ہوتا اب اتنے حفاظ امریکہ میں بن رہے ہیں کہ وہ تراویح کی ضرورت کے لیے کافی ہوتے ہیں۔حفاظ کی مقامی سطح پر تیاری کے ساتھ دوسری جانب صورتِ حال یہ ہے کہ نوجوان نسل کی اکثریت تراویح کے اندر شریک نہیں ہوتی

اگر ہوتی ہے تو تھوڑی دیر کے بعد رخصت ہوجاتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اگر ہم ۲۰ سال پہلے امام امپورٹ کیا کرتے تھے تو اب ۲۰ سال بعد ہمیں مقتدی امپورٹ کرنے پڑیں گے۔

زیادہ پریشانی کا معاملہ والدین اور اولاد کے درمیان تعلقات کی نوعیت کا ہے۔ امریکی معاشرے کا پورا زور اور دباؤ اس پر ہے کہ اولاد پر ماں باپ کو حکم دینے اور کسی قسم کا فیصلہ کرنے پر مجبور کرنے کا اور اچھے برے میں تمیز کرنے کی رہنمائی دینے کا کوئی اختیار نہیں۔ قانونی دفعات بھی تمام اس حق میں ہیں کہ ماں باپ اولاد کی کسی قسم کی کوئی رہنمائی نہیں کر سکتے، ان کے ساتھ کوئی زبردستی نہیں کر سکتے، انہیں کسی ایک راستے پر چلانے کی کوشش نہیں کر سکتے اور اگر آپ ایسا کریں گے تو آپ کو سنگین نتائج بھگتنے پڑیں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمان نوجوان وہاں پر ہر طرح سے حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ (آؤ فلاح کی طرف) کی بجائے حَیَّ عَلَی اللَّغْوِ وَالْھَوٰی کی آواز پر دوڑے جا رہے ہیں جو کہتی ہے ’’آؤ فضول چیزوں اور ہر مَن چاہی خواہشات کے پیچھے‘‘۔ لیکن روک ٹوک اور ہدایت و نصیحت اور دباؤ ڈالنے کے جو نارمل ذرائع مسلم سوسائٹیز میں حاصل ہوتے ہیں وہ وہاں پر موجود نہیں ہیں۔ اگر آپ کا بچہ آپ کی شکایت کرے کہ میرے ماں باپ میرے ساتھ زبردستی کر رہے ہیں مجھے نماز پڑھنے کو کہتے ہیں یا لڑکی شکایت کرے کہ میرے ماں باپ میرے ساتھ زبردستی کرتے ہیں، مجھے حجاب پہننے یا پردہ کرنے کو کہتے ہیں یا یہ کہ میرے ماں باپ مجھ سے زبردستی کرتے ہیں، مجھے لڑکوں سے ملنے نہیں دیتے۔ یہ تمام جرائم ایسے ہیں جن کے نتیجے میں یا تو آپ کی اولاد آپ سے چھین لی جائے گی یا آپ کو گھر سے نکال دیا جائے گا۔ قانونی طور پر اگر بچے پولیس سے رجوع کریں یا عدالتی چارہ جوئی کریں تو اس کے نتائج یہی ہیں۔ معاملہ اب اس سے زیادہ سنگین ہو چکا ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر آپ کا ایک نوجوان بیٹا گھر میں آ کے اعلان کرے کہ مَیں ہم جنس پرست ہو گیا ہوں یا مَیں ہم جنس پرست ہوں اور اگر آپ نے اس پر کوئی ذرا سا بھی احتجاج یعنی غصے کا اظہار کیا تو آپ نے جرم کیا۔ آپ کا صرف ایک ہی فرض ہے کہ آپ کہیں کہ بیٹا تم جو چاہتے ہو تم کرو۔ جس میں تمہاری خوشی ہے تم وہی کرو۔ جن والدین نے اس کے خلاف کیا ہے انہوں نے اس کے سنگین قانونی نتائج وہاں پر بھگتے ہیں۔

امریکی معاشرہ بہرحال مضر رسانی کی حد تک ایک بہت آزاد معاشرہ ہے یہ امریکہ کی

ایک بہت ہی تلخ حقیقت ہے جس سے وہ لوگ واقف نہیں ہوتے جنہوں نے وہاں ایک عرصہ سکونت نہ اختیار کی ہو۔ دوسری طرف صورتِ حال یہ ہے کہ عام امریکی نوجوانوں میں جو اخلاقی اور مجرمانہ مسائل ہیں اب مسلمان نوجوان اُن سے کسی طرح بھی محفوظ نہیں ہیں۔ بلاروک ٹوک سیکس اور منشیات وہاں کے نوجوانوں کا مسئلہ ہے، مسلمان نوجوان اس سے محفوظ نہیں ہیں۔ جو ساری خرابیاں اور جگہوں پر باقی معاشرے کے اندر ہیں وہ ساری اسی لیول کی مسلمانوں کے اندر بھی موجود ہیں، کیوں؟ اس لیے کہ مسلمان ان کے اندر اچھی طرح مل جل گئے ہیں، ان سے علیحدہ نہیں رہے ہیں۔

اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کے پاس اپنی تہذیبی اور اخلاقی حفاظت کے جو تھوڑے بہت ہتھیار ہو سکتے تھے، مسلمانوں نے انہیں بند کر کے رکھا ہوا ہے۔ اب مَیں اس کی ایک مثال دیتا ہوں۔ شاید آپ لوگوں نے یہ واقعہ سنا ہو۔ حدیث میں ہے کہ ایک بدو ایک دفعہ مسجد نبوی میں آیا اور اس نے وہاں پیشاب کرنا شروع کر دیا۔ صحابہ نے اُسے روکنے کی کوشش کی مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے کہا کہ اسے کرنے دو اور بعد میں اس جگہ کو صاف کر دیا گیا۔ یہ واقعہ آپ نے شاید سنا ہوگا، اگر آپ امریکہ میں رہتے ہیں تو ضرور متعدد بار سنا ہوگا اور اگر امریکہ میں رہتے ہوئے کسی بھی مسجد سے آپ کا کوئی تعلق ہے تو آپ نے یہ واقعہ بارہا اور بار بار سنا ہوگا، سنتے سنتے آپ کے کان پک گئے ہوں گے۔ اور اس سے دور رَس نتائج نکالے گئے ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ برآمد کیا گیا ہے کہ کوئی آدمی کیسے بھی غلط سلط کر رہا ہو اُسے روکنا تمہارا جرم ہوگا چونکہ مسجد میں پیشاب کرنے سے بڑا جرم کیا ہو سکتا ہے، جب اسے کرنے کی اجازت دی گئی، کہا کہ اسے مت روکو۔ پس اگر اس حرکت کے علاوہ کوئی فرد کوئی اور حرکت کر رہا ہے تو خبردار اگر تم نے اُسے روکنے کی کوشش کی۔ اگر ایک عورت نیم عریاں لباس پہن کے مسجد میں آتی ہے تمہیں حق نہیں ہے کہ تم اس پر اعتراض کرو۔ ایک نوجوان الٹی سیدھی حرکتیں مسجد کے اندر کر رہا ہے تمہیں ہرگز حق نہیں ہے کہ تم اس کے خلاف کچھ بھی کہو۔ اگر تم خود اس سے بات کرو گے تو اُس کے ماں باپ تم سے لڑنے کے لیے آ جائیں گے۔ اگر معاملہ اس سے زیادہ بڑھا تو وہ خود پولیس کو بلا لے گا اور اس کے علاوہ خود مسجد کی انتظامیہ کہے گی کہ آپ اس طرح کی باتیں کر کے اس بچے کو مسجد سے دور کر دیں گے، جیسا بھی آ رہا ہے اسے آنے دیں۔ تو نتیجہ یہ ہے کہ

جیسی جو کچھ بھی غلط سلط حرکتیں ہو رہی ہوں ان کی کوئی روک تھام وہاں پہ ناممکن ہے۔ نہی عن المنکر کو خود ایک منکر قرار دے دیا گیا۔ نہی عن المنکر کا شعبہ پورے کا پورا ہم نے امریکہ میں خالی کر دیا ہے۔ اس کے بعد آپ صرف حالات کے رحم و کرم پر ہیں کہ آپ کے بچے اتنے اچھے نکلیں کہ وہ اپنے اندرونی جذبات کے تحت پھر بھی آپ کی بات مانیں، سیدھے رہیں اور جو بھی حالات کا دباؤ ہو اُس کا صحیح طرح سے مقابلہ کر سکیں۔ اگر وہ ایسا نہ کریں تو پھر آپ کے پاس کوئی اختیار نہیں ہے۔ دوسری نسل میں ہم دیکھ رہے ہیں کہ کتنا فرق پڑ رہا ہے۔ تیسری نسل میں معاملہ بہت ہی زیادہ سنگین ہے اور قومی اور عالمی سطح پر پہچانے جانے والے نامور دین دار گھرانوں کی تیسری نسل میں ایسی چیزیں ہو رہی ہیں جو نا قابل بیان ہیں۔

دینی گھرانوں کے لوگ سمجھتے ہیں کہ اگر ہمارے گھر کا ماحول اچھا ہوگا تو ہر چیز صحیح ہو جائے گی۔ بات ایسی نہیں ہے، بات بہت پیچیدہ ہے۔ بہت اچھے دینی گھرانوں کے بچے گھر سے نکلتے ہیں، کالج جاتے ہیں، فلاسفی کا ایک کورس لیتے ہیں اور ملحد ہو جاتے ہیں، اللہ کے وجود کا انکار کر دیتے ہیں اور یہ چیز طوفان کی طرح پھیل رہی ہے اور آپ کے پاس پھر کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ اسے سمجھائیں، آپ کا کام محض دعا کرتے رہنا ہے۔ لیکن وہ ماحول اتنا شدید تھا جس سے مقابلے کے لیے آپ نے خود ان کی تربیت میں اور ان کی تعلیم کے لیے وہ سب کچھ نہیں کیا جو آپ کو کرنا چاہیے تھا۔ معاشرے کے اندر وہ ضم رہے اور اس کے نتیجے میں وہاں کے معاشرے کی جتنی بھی خرابیاں اور گندگیاں تھیں وہ ساری کی ساری ان کے اندر آرام سے آ گئیں کیونکہ روک تھام کا کوئی ذریعہ وہاں پہ نہیں ہے۔ تو یہ چند ایک تلخ حقائق ہیں وہاں کے معاشرے کے بارے میں کہ ''ہر کہ در کانِ نمک رفت نمک شد'' والا معاملہ ہے۔

بظاہر ہم دیکھ رہے ہیں کہ مسلمانوں نے بڑی ترقی کی، ان کی مساجد بہت بڑھ گئی ہیں اور ان کے دوسرے کچھ دیگر ادارے بہت زیادہ ہو گئے ہیں اور اسلام کی باتیں، تبلیغ اور مذہبی کام بہت ہو رہے ہیں لیکن بے دینی کے کام بھی بہت ہو رہے ہیں اور ان سے زیادہ بد دینی کے کام بہت ہو رہے ہیں۔ ان سب کے ملغوبے کا نتیجہ کیا ہوگا؟ اور یہ نتیجہ آئندہ نسلوں میں کیا اثرات مرتب کرے گا؟ یہ ایک ایسی چیز ہے جو سوچنے سمجھنے والے لوگوں کو بہت پریشان کرتی رہتی ہے۔

تفہیم مغرب

سید خالد جامعی

جدیدیت کیا ہے؟

دنیا کی ۲۳ روایتی، الہامی اور دینی تہذیبوں میں انسان عبد تھا، وہ جو اس نیلی کائنات میں خدا کے آگے سربسجود ایک ہستی تھا جو اپنی آخرت کی اصلاح کے لئے فکرمند اور مستقبل کی حقیقی زندگی کے لیے کوشاں رہتا تھا لیکن اٹھارہویں صدی میں جدیدیت (Modernism) کی آمد کے بعد یہ عبد (جو بندگی کے سانچے میں ڈھلا ہوا تھا) یکایک آزاد ہوگیا۔ بندے (Mankind) سے آزاد فرد (Human being) ہوگیا۔ یہ اصطلاح بھی صرف اس کے حیاتیاتی وجود کی علامت تھی لہٰذا اس کے سیاسی وجود کی وضاحت کے لیے 'شہری' (Citizen) کی اصطلاح استعمال کی گئی جو مختار مطلق (Sovereign) ہوتا ہے۔ اسی آزاد خود مختار وجود کے لیے ایک ایسی ریاست قائم کی گئی جو Republic کہلائی، ایسی ریاست جہاں عوام کا حکم ارادہ عامہ (General will) کے تحت چلتا ہے، اس کے سوا کسی کا حکم چل نہیں سکتا۔ اگر کسی ریاست میں کسی اور کا حکم بظاہر چل رہا ہے تو اس حکم کے چلنے کی اجازت بھی عوام کی اجازت سے ملی ہے اور یہ اجازت مطلق نہیں ہے حاکم حقیقی (عوام) اس اجازت کو جب چاہیں منسوخ کر سکتے ہیں۔ مثلاً پاکستان کے دستور میں اللہ کی حاکمیت کو سب سے بالاتر حاکمیت کے طور پر قبول کیا گیا ہے، اصولاً منشورِ بنیادی حقوق کے تحت ایسی حاکمیت کو قبول نہیں کیا جا سکتا لیکن پاکستانی معاشرہ ابھی جدید نہیں ہوسکا، ابھی روایات اور مذہب کے شکنجوں میں جکڑا ہوا ہے لہٰذا مجبوراً مذہب کو بھی عوام کی اجازت سے دستور میں عارضی طور پر حاکمیت دی گئی ہے۔ مگر یہ حاکمیت حتمی نہیں عوام جب چاہیں کثرت رائے سے حاکمیت الٰہ کی اس شق کو منسوخ کر سکتے ہیں۔ ۲۰۰۹ء میں یہ حادثہ ہو چکا ہے جب ایم کیو ایم نے قومی اسمبلی کی ایک کمیٹی کے اجلاس میں دستور سے خدا کی حاکمیت کی شرط ختم کرنے کے لیے قرارداد پیش کی۔ قرارداد کی مخالفت پاکستان پیپلز پارٹی نے کی۔ رائے شماری ہوئی تو خدا کی حاکمیت دو ووٹوں کی برتری سے برقرار رہی۔ اس وقت کے ایک پاکستانی اخبار نے سرخی لگائی "خدا کی حاکمیت دو ووٹوں کی اکثریت سے بچ گئی"۔

جدید انسان قائم بالذات، فاعل خودمختار، ہدایت میں خود کفیل، خارجی ذریعۂ ہدایت سے بے نیاز اور ماوراء، اپنے فیصلے خود کرنے کا حقیقی مجاز، ہر خارجی و بیرونی ذریعۂ علم کی حاکمیت ورہنمائی سے ماوراء، خیر وشر خلق کرنے کا اختیار رکھنے والی ہستی، ہر ایک کی عبادت سے بے نیاز، اپنے معبد میں خود اپنی عبادت میں مصروف لا فانی، نورانی، حیوانی وجود ہے لہٰذا جدیدیت میں صرف انسان ہی اصل حقیقت، اصل وجود ہے کیونکہ اس کے وجود میں شک نہیں کیا جاسکتا۔ وہی مرکزِ کائنات ہے کیونکہ یہ خدا مرکزِ کائنات نہیں۔ یہ کائنات بھی انسان کے لیے ہے۔ ٹائن بی کے الفاظ میں حقیقت کے ادراک کے دو طریقے ہیں: ایک سائنسی (Scientific Truth)، دوسرا شاعرانہ یا پیغمبرانہ (Poetic Truth)۔ پہلے طریقے سے علم مشاہدے اور تجربے سے ملتا ہے دوسرے طریقے سے ملنے والا علم محض شاعرانہ حقیقت ہے۔ ٹائن بی کے خیال میں لاشعور کی شاعرانہ سطح پر قابلِ فہم مشاہدہ کا نام ہی پیغمبری ہے۔ جدید انسان صرف وہ ہے جو حسی، تجربی، اختیاری سائنسی ذریعۂ علم پر یقین رکھتا ہے اور غیر حسی، غیر تجربی، غیر طبعی، مابعد الطبیعیاتی، الہامی مذہبی ذرائع سے ملنے والے علم کو جہل ظلمت و گمراہی تصور کرتا ہے کیونکہ ان ذرائع سے ملنے والے علم کی تصدیق تجربہ گاہ میں آلات سائنس سے نہیں ہوسکتی لہٰذا یہ تمام علوم جہالت میں شمار ہوتے ہیں۔ جدید انسان وہ ہے جو ان جہالتوں سے ماوراء ہے اور خیر وشر کے پیمانے خود خلق کرتا ہے، کسی الہامی، روایتی اور دینی علم سے پیمانے اخذ نہیں کرتا۔ اس لیے جدیدیت تاریخ کا انکار کرتی ہے، سترہویں صدی سے پہلے کے زمانے کو تاریخ کا تاریک ترین زمانہ (Dark Ages) قرار دیتی ہے۔ جدیدیت ماضی کا انکار کرنے کے باوجود ماضی سے کلاسیک کے نام پر وہ تمام تصورات، نظریات اور عقائد قبول کرتی ہے جو اس کی ابلیسیت سے ہم آہنگ ہیں مثلاً وہ یونان سے ارسطو کا نظریۂ ابدیتِ دنیا لے کر آخرت کا انکار کرتی ہے۔ سترہویں صدی سے پہلے کے انسان کو انسان تسلیم نہیں کرتی، جدیدیت کے خیال میں اصل انسان تو روشن خیالی کے فلسفے کے بعد ظہور پذیر ہوا۔ جدید انسان ہی حقیقی معنوں میں صاحب علم ہستی ہے جو روشنی سے منور ہے کیونکہ اس نے جہالت کی تاریخ کا انکار کرکے مذاہب سے بغاوت کرکے اپنے لیے زندگی کا راستہ اپنی ہی روشنی، اپنی ہی رہبری و رہنمائی میں خود طے کرنے کا فیصلہ کیا۔ نشأۃ ثانیہ، روشن خیالی اور جدیدیت انسان کی اسی خود کفالت، فارغ البالی، خود انحصاری، خودمختاری اور آزادیٔ کامل کا نام ہے، جدید انسان کو زندگی کا سفر طے کرنے کے لیے اپنے سوا کسی اور ذریعہ سے رجوع

کرنے کی کوئی ضرورت نہیں جدیدیت۔ جدید انسان کا یہ دعویٰ کہ عقلیت آفاقی ہوتی ہے اور عقلیت کی بنیاد پر آفاقی اقدار، آفاقی نظام، آفاقی اخلاقیات وضع کی جاسکتی ہیں، پس جدیدیت (پوسٹ ماڈرن ازم) نے رد کردیا اس نے بتایا کہ عقل اپنی تاریخ، تہذیب اور ثقافت میں محصور، مقید، مسدود اور محدود ہوتی ہے۔ مغرب میں اب اس رائے پر عمومی اتفاق ہے۔ اس موقف کی تفصیلات کا مطالعہ کرنے کے لیے درج ذیل کتابوں کو دیکھیے:

- Towards the Understanding of Rationality, Haber Mass
- Readings in the Philosophy of Social Sciences, McIntyre J. Gray
- Madness and Civilization, Foucault
- False Dawn, J. Gray
- Enlightenment Wake, J Gray
- Contingency, Irony and Solidarity, Richard Rorty
- Heidegger and Progress, Richard Rorty
- Relativity, Objectivity & Philosophical Papers, Vol. II, Richard Rorty

جدیدیت، مغربیت، جدید انسان، جدید فلسفے، جدید تعقل غالب کو سمجھنے کے لیے افلاطون و ارسطو، ڈیکارٹ، ہیوم، کانٹ کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ ہیوم اور کانٹ نے جدیدیت کے فکری اور عملی تسلط میں مرکزی کردار ادا کیا ہے۔ کانٹ کا کمال یہ ہے کہ اس نے عقلیت اور تجربیت کو ملا کر جدید سائنسی انقلاب کی فکری اساس کو ممکن بنایا اور سائنسی، طبعی اور تجربی علمیت کو ہی اصل العلوم قرار دے کر ان تمام علوم کو دائرے سے خارج کردیا جو عقلیت اور تجربیت کے مادی، حسی اور طبعی معیارات پر پورا نہیں اترتے۔ اس طرح جدیدیت نے تمام مابعد الطبیعیاتی سوالات کا انکار کردیا اور ایک نئی مابعد الطبیعیات جنم دی جو علمیت (Epistemology) سے مابعد الطبیعیات (Metaphysics) نکالتی ہے، لہٰذا ڈیکارٹ، ہیوم اور کانٹ کی علمیت سے جو مابعد الطبیعیات نکلی وہ ہائی ڈیگر کے الفاظ میں حاضر و موجود کی مابعد الطبیعیات (Metaphysic of Presence) تھی۔

جدیدیت کو سمجھنے کے لیے جدید تصور نفس، جدید شخصیت، جدید معاشرت، جدید ریاست، جدید مابعد الطبیعیات کے نظریات سے واقفیت ضروری ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ

جدیدیت اور جدید انسان کی پیدائش کا تاریخی پس منظر جاننا بھی ضروری ہے، وہ کون سے تاریخی عوامل و اسباب تھے جنہوں نے جدیدیت اور آزادی کے عقائد کو ابھرنے اور پنپنے کا موقع دیا؟ روایتی معاشرہ کمرشل معاشرے میں کیسے تبدیل ہوا؟ کامرس اور لبرٹی کے تصورات نے روایتی زندگی پر کیا اثرات ڈالے؟ جمہوریت، سرمایہ داری، بنیادی حقوق کے قافلے کس طرح وجود میں آئے؟ جدیدیت سے پہلے مغرب عیسائیت کی آغوش میں تھا لہٰذا جدیدیت کے ظہور، فروغ اور ارتقاء کو سمجھنے کے لیے، عیسائیت کی تاریخ کا مطالعہ بھی نہایت ضروری ہے۔
عیسائیت میں مذہب اور ریاست کی تفریق تھی کیونکہ عیسائیت کے پاس شریعت نہیں تھی لہٰذا عیسائی رومن ایمپائر نے ریاست کے لیے قوانین رومی قوانین سے لیے۔ رومۃ الکبریٰ دو حصوں میں تقسیم تھی شہرِ خدا (City of God) اور شہرِ انسان (City of Man) ایک جگہ خدا کا یعنی انجیل کا کلیسا کا اور پوپ کا حکم چلتا تھا دوسری جگہ ریاست جہاں بادشاہ کا رومی قانون چلتا تھا۔ پوپ زمین پر خدا کا نمائندہ تھا لہٰذا اس کی رائے مذہبی معاملات میں قطعی حتمی رائے تھی، اس رائے سے کسی کو اختلاف کی اجازت نہ تھی لہٰذا عیسائیت میں کسی مذہبی مکتب فکر کو پنپنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ جس مکتب فکر نے پوپ کی رائے سے اختلاف کیا اسے صفحہ ہستی سے مٹا دیا گیا۔ کلیسا نے رومی ریاست کے انتظامی ڈھانچے کی اتباع میں اپنے مذہبی ڈھانچے کو رومی بیوروکریٹک اسٹرکچر میں تبدیل کر دیا۔ پادریوں کے مناصب اور مرتبے قائم کر دیے گئے۔ ان مناصب سے گزر کر ہی سب سے اونچے منصب پوپ تک کوئی پہنچ سکتا تھا لہٰذا پادریوں میں دائمی مسابقت پیدا ہو گئی۔ گیارہویں صدی میں پوپ گریگوری Pope GregoryVII کو جب اپنے اقتدار کی گرفت کمزور محسوس ہوئی اور اسے اندازہ ہوا کہ فرانس، جرمنی، برطانیہ کی بادشاہتیں آزاد ہونے کی کوشش کر رہی ہیں تو اس نے ان ریاستوں کی بغاوت کو کچلنے کی بجائے بغاوت کا رخ مسلمانوں کی طرف موڑ کر عالمی صلیبی جنگوں کا آغاز کرا دیا۔ اس نے تمام عیسائی بادشاہتوں کے سامنے امت مسلمہ کا نام نہاد خطرہ دکھا کر ان سب کو عظیم مذہبی جنگ پر آمادہ کیا۔ ان جنگوں کے لیے سرمایہ بادشاہوں نے کلیسا سے سود پر حاصل کیا جس نے کلیسا کے تقدس کو نقصان پہنچایا۔ یہ مذہبی جنگ پانچ سو سال تک جاری رہی جس میں تمام یورپی بادشاہوں کے کئی سو بیٹے، بھانجے اور بھتیجے عیسائی مذہبی ریاست کے غلبہ کی راہ میں مارے گئے۔ اس طرح پوپ نے پانچ سو سال تک عالمگیر جنگ برپا کرا کے کلیسا کے خلاف بغاوت کا

رخ عالم اسلام کے خلاف موڑ دیا Jonathan Lyons کی کتاب Islam Through Western Eyes کے باب سوم کا مطالعہ پوپ کے بارے میں صلیبی جنگوں کے حوالے سے چونکا دینے والے انکشافات کرتا ہے۔[۱]

عیسائی دنیا پر پوپ کے ظلم وتشدد (inquisition) جادوگری کے الزام میں ہزاروں عورتوں کے قتل عام وغیرہ کے نتیجے میں جرمنی میں پروٹسٹنٹ ازم کا ظہور ہوا۔ کیلون ازم اور پیورٹن ازم برطانیہ اور سوئٹزرلینڈ میں کیتھولک کلیسا کی حاکمیت کے خلاف بغاوت کے مظاہر تھے۔ اس کے نتیجے میں پورے یورپ میں عیسائی مذہبی فرقوں کے درمیان سالہا سال تک خوفناک مذہبی جنگیں ہوئیں۔ اسی عہد میں قوم پرست ریاستوں کا ظہور ہوا اور قومی چرچ بھی وجود میں آنے لگے کلیسا کی عالمی حیثیت مجروح ہوئی۔ مذہبی بنیاد پر ریاستوں کے خاتمے کا معاہدہ آ گیا اور مذہبی جنگیں بند ہو گئیں۔

سولہویں صدی میں یورپی عیسائی حکومتوں نے پوری دنیا پر یلغار کی اور دنیا کے بہت بڑے حصہ کو غلام بنا لیا۔ کولونیل ازم کے ذریعے یورپ میں سونے کے دریا بہنے لگے، مال و دولت کا سیلاب آ گیا۔ اسی سیلاب نے جدید سائنس وٹیکنالوجی کے لیے وسائل کا انبار مہیا کر دیا اور ایجادات کے فکری ونظری انقلاب کو عملی انقلاب میں تبدیل کر دیا۔ عیسائی یورپی جب دنیا بھر کو تاخت وتاراج کر رہے تھے تو کلیسا نے انہیں کوئی سرزنش نہیں کی کلیسا کی جانب سے لوٹ مار کی اس حرام دولت پر کسی قسم کا ردعمل ظاہر نہیں کیا گیا، یورپ کے تقریباً ہر گھر نے لوٹ مار کی اس دولت سے استفادہ کیا، سرمایہ دارانہ شخصیت، معاشرت، حکومت اور ریاست کی تعمیر میں لوٹ مار کی اس دولت نے کلیدی کردار ادا کیا۔ جب وہ شخصیت، انفرادیت، معاشرت، ریاست، حکومت وجود میں آ گئی جس کا اصل سبب پوپ اور چرچ کی غفلت تھا تو لبرل انقلاب نے عیسائی مذہبی حاکمیت کے خلاف زبردست بغاوت کر دی۔ دنیا دار دین کی پابندیاں کیسے برداشت کر سکتا ہے؟ جب کلیسا نے لوگوں کے دنیا دار بننے پر کسی ردعمل، افسوس، دکھ کا اظہار نہیں کیا تو اس نے لوگوں کی گناہ گار زندگی کو عملاً سند جواز مہیا کر دی۔ انہیں لبرل، آزاد خیال اور

[۱] Jonathan Lyons Islam Through Western Eyes: From the Crusades to the War on Terrorism, Chapter 3 P.46,47 Columbia Press, New York, 2012

اخلاقیات سے بے پروا بنانے میں کلیسا نے مجرمانہ کردار ادا کیا۔ اگر ہیبر ماس کے الفاظ مستعار لیے جائیں تو گرجا کی خاموشی مجرمانہ خاموشی (Criminal Silence) تھی۔امریکہ و یورپ کے لوگ روحانی طور پر دیوالیہ ہو چکے تھے۔ کالونیل ازم کے ذریعے ان کے ضمیر سیاہ، غیرت مذہب، اخلاق سے محروم ہو گئے تھے۔ جبر وتشدد اور دوسری قوموں پر بہیمانہ مظالم نے ان کی عیسوی مذہبی شناخت انفرادیت، مذہبیت، کو پارہ پارہ کر دیا تھا مگر تاریخی روایتی طور پر وہ عیسائی ہی تھے لیکن ان کا طرزِفکر، طرزِ حیات بدل چکا تھا اور کیتھولک عیسائی اخلاقیات کے ساتھ ہم آہنگ نہیں تھا لہٰذا اس خلاء کو جدید فلسفے نے پُر کر دیا اور گناہ گار، خبیث زندگی کا اخلاقی، علمی، منطقی، فلسفیانہ، عقلی جواز" آزادی" کے فلسفے کے ذریعے دیا گیا۔اس بدلے ہوئے انسان کی نفس پرستی کا مذہبی جواز پروٹسٹنٹ ازم نے دیا اور اس جدید مادہ پرست مذہب کی روشنی سے استفادہ کرتے ہوئے اسکاٹش انلائٹمنٹ نے ارتکاز سرمایہ اور سرمایہ میں مسلسل اضافے کا فلسفیانہ جواز مہیا کیا تا کہ آزادی ولذت میں اضافہ کیا جا سکے، حالات سازگار تھے موسم اچھا تھا لہٰذا آزادی، بے راہ روی، عقلیت پرستی، لذت پرستی، شہوت اندوزی نے مغرب کے تمام علاقوں میں جڑ پکڑ لی۔ یہی جدیدیت کا تاریخی ارتقاء ہے جدیدیت کے وجود اس کے ارتقاء اور اس کے اظہار کے پس منظر کو جانے بغیر ہم جدیدیت کی حقیقت سے آگاہ نہیں ہو سکتے۔

جدیدیت کے دو بڑے اور اہم ترین مظاہر کانٹ اور اسکاٹش انلائٹمنٹ ہیں۔ جدیدیت کی فکر کو کانٹ کے بغیر سمجھا نہیں جا سکتا۔ان دونوں مظاہر پر اصل غلبہ پروٹسٹنٹ ازم کا ہے۔ کانٹ پروٹسٹنٹ عیسائی تھا اور اسکاٹش انلائٹمنٹ بھی پروٹسٹنٹ ازم کے زیر اثر تھی جس کے ذریعے جدید معاشیات (ماڈرن اکنامکس) کا ظہور ہوا۔ اسکاٹش انلائٹمنٹ کے ذریعے سادگی، فقر، درویشی، دنیا سے گریز اور کم سے کم تمتع کی تاریخی روحانی صفات کو قابل ملامت بنا دیا گیا۔ بہترین آدمی وہ ہے جو زیادہ سے زیادہ دولت رکھتا ہے لہٰذا جینٹل مین (Gentle man) اسکاٹش انلائٹمنٹ میں اس شخص کو قرار دیا گیا جو دولت مند ہو۔ یہ سبق پروٹسٹنٹ ازم نے دیا تھا کہ جو دنیا میں کامیاب ہے وہی آخرت میں بھی کامیاب ہوگا جو یہاں ناکام ہے اس کا آخرت میں کامیابی کا کوئی امکان نہیں ہے لہٰذا جدید معیشت نے انسان کا جو تصور پیش کیا وہ خالص مادہ پرستانہ ہے جس کا مقصد اپنے ذرائع آمدنی میں اضافہ ہے تا کہ اس سے وہ زیادہ سے زیادہ خواہشات پوری کر کے اپنی آزادی میں اضافہ کر سکے۔ زندگی کے ہر

شجر سے خوشی کے خوشے چن سکے اس کا مقصد لذت، معیار زندگی میں مسلسل اور مستقل اضافہ ہے اسی لیے جدیدیت میں سرمایہ اور آزادی لازم وملزوم ہیں۔سرمایہ آزادی کے براہ راست متناسب ہے سرمایہ جتنا بڑھتا ہے آزادی کا دائرہ اتنا ہی وسیع ہوتا ہے۔آزادی کے دائرے کی وسعت لامحدود ہے۔کیتھولک ازم فقر وفاقہ، درویشی، رہبانیت، سادگی اور سیدھی سادی زندگی کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور دیگر انبیاء علیہم السلام کی اتباع میں قابل فخر طرز زندگی کے طور پر پیش کرتا ہے لیکن کالونیل ازم کے بعد جب یورپی لوگوں کا طرز زندگی، معاشرت، انفرادیت تبدیل ہوئی تو ان کی گناہ گار زندگی کیتھولک ازم کے بجائے پروٹسٹنٹ ازم سے ہم آہنگ ہوگئی لہٰذا لوگ یا تو سیکولر، ملحد، مذاہب سے آزاد ہوگئے یا کیتھولک ازم سے نکل کر لوتھر کی عیسائیت میں داخل ہوگئے جہاں ہر شخص کو انجیل کی تشریح کا اختیار تھا۔کیتھولک کلیسا کی غفلت، لا پرواہی اور کالونائزیشن کے خلاف دانستہ خاموشی نے آزادی، ترقی اور معیار زندگی میں مسلسل و مستقل اضافے کی اقدار کو یورپ کے عیسائیوں کے لیے ایک فطری طرز زندگی بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔

جدیدیت کے اہم مفکرین ڈیکارٹ، اسپینوزا، لائبنز، لاک، برکلے، ہیوم، ہیگل مارکس، فختے، روسو، والٹیر، ٹاکوویلی، ہابس، کانٹ وغیرہ ہیں، کانٹ نے ہیوم سے اثر پذیر ہوکر تجربیت وعقلیت کے آمیزے سے وہ فلسفہ علم پیش کیا جس کے نتیجے میں سائنٹفک میتھڈ کے معیار پر نہ اترنے والے علوم علم کی اقلیم سے خارج کر دیے گئے۔اس نے مابعد الطبیعیات کا انکار نہیں کیا صرف یہ کہا کہ ہمارے پاس وہ ذرائع اسباب وسائل ہی نہیں ہیں جن سے ہم ماوراء الطبیعیاتی امور تک رسائی حاصل کر سکیں۔جدیدیت کو سمجھنے کے لیے درج ذیل کتابوں کا مطالعہ فائدہ مند رہے گا:

1) The Dilecties of Enlightement, Adarno
2) One Dimensional Man, Marcuse
3) What is Enlightenment, Kant (Article)
4) What is Enlightenment? Foucault (Article)
5) Cultural Contradictions of Capitalism, Danial Bell
6) The Betrayal of Tradition, Hana Arent

جدیدیت میں انسان پرستی کی مختلف شکلیں

انفرادی انسان پرستی (Individual human worship) لبرل ازم، لبریٹرین ازم

مکتب فکر میں فرد کی آزادی کے دائرے کو وسیع کرنا سب سے اہم قدر ہے۔اس مکتب فکر کے یہاں آزادی کا انفرادی دائرہ اجتماعی دائرے کے مقابلے میں اہم ہے لہٰذا یہ مکتب فری مارکیٹ پر یقین رکھتا ہے، آزادانہ مقابلہ کا قائل ہے ہر فرد کو اس کی صلاحیت کے مطابق مارکیٹ سے حصہ ملنا چاہیے Each according to his ability۔اس مکتبِ فکر کے یہاں منفی آزادی (Negative Freedom) کا تصور ملتا ہے، اجتماعی انسان پرستی (Collective human worship) نیشنل ازم (قوم)،سوشل ازم (کلاس) فاشزم (فرد کی پرستش اجتماعیت کے لیے)،ریس ازم (نسل)،کمیونزم،کمیونٹی Feminism،عورت (Gender)،فاشزم اجتماعیت کی وہ شکل ہے جہاں اجتماعیت کسی ایک فرد میں حلول کر جاتی ہے۔فرد کی پرستش اس اجتماعیت کی راست پرستش ہے اجتماعیت کا اظہار کسی ایک فرد کی پرستش کی صورت میں ہوتا ہے جو نجات دہندہ ہوتا ہے مسولینی، اسٹالن، الطاف حسین اس کی مثال ہیں، انسان پرستی کی یہ دونوں شکلیں اصلاً آزادی کے تصور کی دو شکلیں ہیں انفرادی آزادی جسے Negative Freedom کہا جاتا ہے دوسرا اجتماعی آزادی جسے Positive Freedom کہا جاتا ہے۔لبرل ازم وغیرہ منفی آزادی کے حامل ہیں جہاں فرد کو زیادہ سے زیادہ آزادی دی جاتی ہے۔مثبت آزادی کے حاملین میں انارکزم، فیمن ازم، نیشنل ازم، فاشزم، سوشلزم وغیرہ ہیں جہاں اجتماعیت کے ذریعے کسی گروہ یا طبقے یا صنف یا نوع یا نسل کی آزادی کا دعویٰ کیا جاتا ہے۔

جدیدیت کے علمیاتی اظہارات

عقلیت و تجربیت دونوں کا اختلاط ہوا جس سے سائنٹفک میتھڈلوجی نکلی جو جدیدیت کی علمی توجیہ ہے۔رومانوی تحریک (Romanticism) پس جدیدیت (پوسٹ ماڈرن ازم) جدیدیت کی مابعد الطبیعیاتی تشریحات Materialism, Idealism, Realism وغیرہ ان سب میں مشترک قدر انسان پرستی (ہیومن ازم) ہے لیکن کوئی مابعد الطبیعیات علمی بنیادوں پر یقینی دعویٰ نہیں کر سکتی لہٰذا مابعد الطبیعیات کی علمی بنیاد ہی نہیں رہی۔

عالم اسلام/افغانستان　　مدیر

افغانستان: دوسرے سال کی کارکردگی - ایک نظر میں[۱]

تعلیم

سکولوں کی تعداد	18,010		
زیر تعلیم طلبہ	61,65,060	طالبات	40,24,574
دینی مدارس	1142		
طلبہ	2,36,488	طالبات	94,462

دیہات میں مختصر کورسز و تعلیمِ بالغاں کے مراکز

طلبہ	35,828	طالبات	59,247
فنی تعلیم سے فارغ شدہ طلبہ	56,850		

اعلیٰ تعلیم

25 سرکاری یونیورسٹیوں میں پی ایچ ڈی پروگراموں کا اجراء	9
ماسٹرز پروگرامز	40
بیرون ملک بھیجے گئے طلبہ، برائے ڈاکٹوریٹ	81
ماسٹرز پروگرامز	158
کل زیرِ تعلیم طلبہ	4,71,360

اقتصادیات

ڈالر کے مقابلے میں 'افغانی' کی قدر میں اضافہ	4.4 فیصد

---

[۱] ماخذ: ماہنامہ شریعت، شمارہ ستمبر ۲۰۲۳ء

افراطِ زر میں کمی	6 فیصد
برآمدات	2 ارب ڈالر
ملکی سرمایہ کاری	150 ملین ڈالر

- 25 صوبوں میں 493 معدنیات کے ذخائر کا سروے کیا گیا۔
- 108 معدنیات کی کانکنی کے ٹھیکے دیئے گئے۔

نظام عدل

عدالتوں میں آمدہ کل مقدمات	2,08,617
حل شدہ مقدمات	1,49,219

اکیڈمی آف سائنسز

46 تحقیقی منصوبے مکمل کیے۔ 176 پر کام جاری ہے۔ آریانا ادبی انسائیکلوپیڈیا شائع ہو رہا ہے۔ مختلف زبانوں میں 30 کتابوں کا ترجمہ۔ اکیڈمی لائبریری کی ڈیجیٹلائزیشن۔ بینکنگ کے عصری مسائل پر تحقیق (مرابحہ گائیڈ لائنیز، مائکروفنانس کمپنیوں کے ڈیلیوری پلانز، مضاربہ تکافل پلانز، بنکوں کے ڈیلیوری منصوبے، مضاربہ گائیڈ لائنز وغیرہ) اکیڈمی میں نیشنل ٹرانسلیشن سنٹر کا قیام۔ 83 علمی و تحقیقی کانفرنسوں کا انعقاد وغیرہ۔

سقوطِ ڈھاکہ

جب بھی ۱۶ر دسمبر آتا ہے تو سقوطِ ڈھاکہ کے زخم تازہ ہو جاتے ہیں۔ سقوطِ ڈھاکہ ایک المیہ تھا لیکن اس سے بڑا المیہ یہ ہے کہ ہم نے اس سے سبق نہیں سیکھا۔ جن قوتوں نے پاکستان کو دولخت کرنے میں بنیادی کردار ادا کیا تھا وہ آج بھی فعال ہیں اور پاکستان کے سادہ لوح عوام اور محبت وطن عناصر جس طرح کل کے سانحے کو نہیں روک سکے تھے آج بھی وہ کمزور اور بے بس نظر آتے ہیں، اللہ تعالیٰ ہمارے حال پر رحم فرمائے۔

standing army existed in the *Khalafat-e-Rashida*. But the creation of these institutions is not prohibited by Sharia – and what is not prohibited is permissible (*Fiqh, Kalam* and *Tasawwuf* also did not exist in the قرونِ اولٰی). In my view in the contemporary struggle against capitalism the articulation of an Islamic media policy is absolutely essential.

Two initiatives are of crucial importance in this regard. On the one hand we need to launch a sustained campaign against the English press to expose its true character as an open enemy of Islam and an imperialist mouthpiece. This campaign regularly exposing the lies and fabrication of the English press (especially Dawn and Express Tribune) should be pioneered by Islamic Urdu print media (*Ummat, Jasarat*, Daily Islam) and efforts should also be made to place it in secular Urdu papers especially *Jang*. There is also a need for an English monthly which analyses economic, social, judicial, governance and foreign policies from an orthodox Islamic perspective. Secondly, our presence in the regional language press (Sindhi, Punjabi, and Balochi) is very weak. Islamic parties and groups have neglected participation in Pakistani language forums. The result is that the regional language media and culture has become dominated by secular and anti-Islamic forces. Localizing Islamic discourse is an urgent task which should be addressed by Islamic media policy.

Suggestions featured above are tentative and of a preliminary nature. There is a need for a sustained debate among Islamic revolutionaries on these issues. Brother Usman Umer's book has opened the door for such a debate. But English is not the appropriate medium for conduct of the debate. I therefore strongly advocate:

(a) The translation of this valuable book in Urdu

(b) Serialization of the Urdu version of this text in a widely read Urdu newspaper or journal (preferably Ummat and Urdu Digest).

Opposition to anti-terrorist legislation exposes a fundamental capitalist governance contradiction – its commitment to capitalist values (individual freedom) contradicts its commitment to capitalist order and authority. We must seek to intensify this contradiction without endorsing human rights ideology or nationalism. As this contradiction intensifies it will lead (gradually) to a weakening of capitalist governance structures through a concomitant weakening of both democratic and nationalist forms. As the state's grip over society is weakened, opportunities will be created for creating an Islamic state in the capitalist state.

The Blasphemy and *Khatm-e-Nabuwwat* laws are effectively co-authored by the legislature and the Islamic reformist movements. They are immensely popular among the Muslim masses. As Islamic revolutionaries we struggle for an extension of their scope and create mass realization of the ineffectiveness of their practical implementation by the capitalist state. This can serve as a means for enhancing Islamic identification and consciousness among the masses. Mass Islamic consciousness provides the basis of Islamic revolutionary struggle within the Pakistani lifeworld.

Espousing implementation deficiencies with regard to the Blasphemy and *Khatm-e-Nabuwwat* laws can also serve as a means for de-legitimating the religious claims of the capitalist state and highlighting its subservience to imperialist pressure. Advocacy of the Blasphemy and *Khatm-e-Nabuwwat* laws provides a basis for linking Islamic revolutionary struggle to the Dawah activities of the Islamic reformists thus widening the ambit of the struggle for اقامتِ دین in Pakistan.

Crafting an Islamic media policy is implicitly rejected by the book which takes the idealist position that media organization is incompatible with Islamic governance. It is true that neither the media industry nor bureaucracy nor

the English media is greater. The English media is an imperialist fifth column in Pakistan depending American on patronage. This accounts for its relative "freedom" with respect to administration formulation. It also accounts for the active role the English press is playing in accommodating the de-sacralization of secular state discourse. The English press is (and the Urdu mainstream press is not) an alien enemy of Islam – both state sponsored Islam and orthodox Islam. Again in the analysis is absence of a discussion of the responses of the Islamic press (Ummat, Jasarat, and daily Islam) to different sources of systemic pressure (establishment, public opinion and imperialist). This would have attained an assessment of the degree to which the Islamic press endures Islamic secularization/ sacralization of the state.

As Islamic revolutionaries we are committed to the project of the deconstruction of capitalist order. We are not idealists and we recognize that deconstructing capitalist order requires intensifying capitalist systemic contradictions. Our endeavor to overthrow capitalist order must be situated within capitalist order. The practical question raised by Umer's analysis therefore is: how can opportunities provided by contradictions within anti-terrorist and anti-Islamic legislation be utilized to weaken capitalist dominance within the state.

As realists we recognize that the immediate task is developing a strategy for the gradual construction of an Islamic state in Pakistan. An Islamic state is necessarily a non-sovereign state subject to the writ of the Sharia and the Islamic knowledge system (فقہ اور کلام). Such sates have recently been created in the Islamic Republic of Iran and the Emirate Islamia Afghanistan and the ongoing struggle in Sahali region (Mali, Niger, and Burkina Faso) is انشاءاللہ likely to lend to the creation of such states in Africa in the not distant future. The creation of an Islamic state in Palestine is also a long term possibility.

Principles Resolution legitimated the lodging of sovereignty thereafter in popular will and practically in the hands of the establishment. The Basic Principles Resolution "sacralized" a secular state. It presented a strategic defeat of the Islamic forces who conceded the arbitrary and unjustified transfer of sovereignty from Allah to the capitalist state of Pakistan. Since 1949 the Pakistani capitalist state has been using such legitimation as a resource constructing a discourse opposing state secularized Islam to historically and traditionally validated Islam.

Brother Umer shows how this has done with reference to legislative acts related to terrorism, blasphemy and asserting the finality of the Prophet صلی اللہ علیہ وسلم. According to his analysis in each case Islam has been used as an instrument for the secularization of state governance practices and Islamic reformist and revolutionary groups have effectively been co-opted in their exercises.

The media has served as a tool for legitimating the secularism based state policies and the marginalization of orthodox Islam. Pakistani media, according to Brother Umer, is not "free" (the book does not recognize that "press" in capitalist state works according to capitalist rationality). The main argument is that administration dominates the media and fashions its discourses. But in his analysis of the media response to state legislations of five leading newspapers brother Umer also recognizes the capitalist contradiction, human rights advocates (i.e. imperialists and their agents and professionals).

The analysis of the news reported in the press reflects differences in the responses to systemic pressures. Both the English (Dawn, the Nation and the News) and Urdu (*Jang*, Nawa-e-Waqt) submit to administrative pressures. The "degree of freedom" (i.e. capitalist subservience) enjoyed by

Dr. Javed Akbar Ansari *Book Review*

Disputed Dilemmas

Interactions of Pakistani Media with the State and Islam[1]
by Usman Umer

This book is a welcome addition to the Sharia literature on the role of the state in media governance from an Islamic revolutionary perspective. It raises some critical questions on which debate among Islamic revolutionaries is urgently necessary.

The book is written in English and Islamic revolutionary discourse in Pakistan is overwhelmingly conducted in Urdu (and recently in Pashto). Therefore, I strongly advocate the urgent translation of this book into Urdu.

Brother Usman Umer argues that the concept of the state as such is un-Islamic and that Islamic politics in our history was systems of governance. The influence of Hallaq's The Impossible State is evident throughout Disputed Dilemmas and the concept of the Islamic state is rejected. This takes revolutionary thought dangerously closer to anarchist perspectives and to خارجی arguments raised against خلافتِ راشدہ. It is a denial of the historic validity of all Islamic regimes.

The distinguishing feature of a state according to brother Usman (and Hallaq) is its claim to sovereignty. Such a claim was made by absolute monarchies in the past (the Roman and Persian emperors) and currently by capitalist states but non-sovereign states (خلافت اور امارت) have also existed throughout history. Describing them as "mere systems of governance" does not seem justified.

The book presents a strong case for the essentially secular character of the Pakistani state. It argues that the Basic

[1] 217 pp, Darul Kitab, Lahore, 2023